حافظ کی شاعری
کے۔ این۔ پنڈت
انجمن ترقی اردو ہند
انجمن ترقّی اردو (ہند) دلّی

بر سرِ تربتِ ما تو ~~آئی~~ آئی گزری همت خواه

که زیارتگه رندانِ جهان خواهد بود

خواجه حافظ شیرازی

بزمِ حافظ

K. M. P 627 a Game...

9 ۱

46 ۲

77 ۳

152 ۴

256 ۵

حافظ کی شاعری

کے۔ این۔ پنڈت

انجمن ترقّی اردو (ہند) اردو گھر نئی دہلی
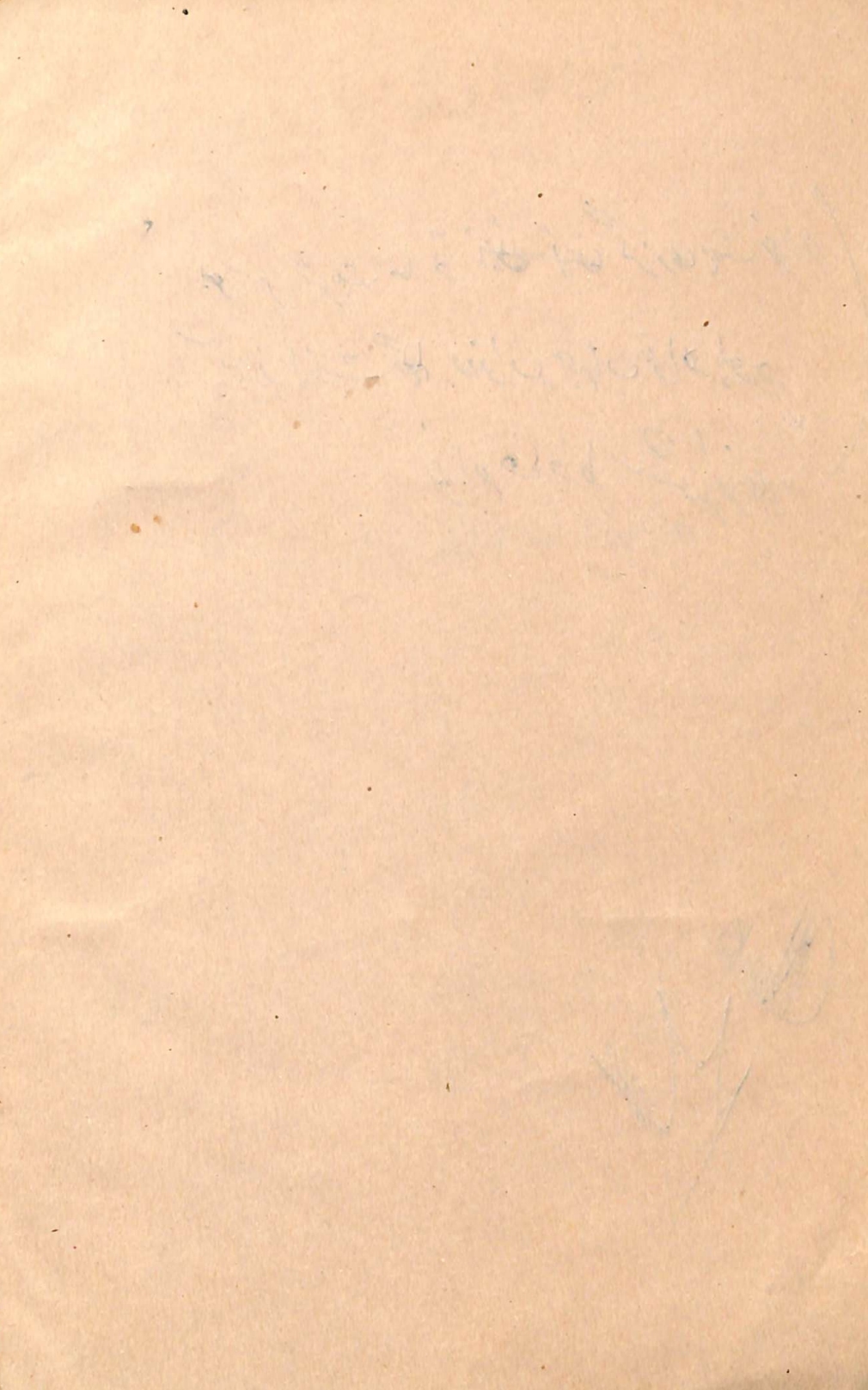
ترتیب

حرفِ آغاز .... خلیق انجم ۵

پیش گفتار .... کے۔ این۔ پنڈت ۹

پہلا باب ....

شیراز ۱۳

دوسرا باب ....

حافظ کے حالات زندگی کے ماخذ ۴۵

تیسرا باب ....

حافظ کی زندگی کے حالات ۷۵

چوتھا باب ....

عصرِ حافظ ۱۴۷

سلسلہ مطبوعات انجمن ترقّی اردو ہند نمبر ۴۰۹

حافظ کی شاعری : کے۔ این۔ پنڈت

سال اشاعت : ۱۹۷۷ء

قیمت : ۱۰/۵۰ روپے

طباعت : اُردو لیتھو پریس شاہدرہ

حرف آغاز

حافظ شیرازی فارسی کے اُن چند شاعروں میں ہیں جنھیں ہندوستان میں غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل رہی ہے۔ دیوانِ حافظ کے بے شمار ایسے مخطوطات ہندوستان کی لائبریریوں میں محفوظ ہیں جنھیں مختلف عہدوں کے مشہور اور غیر مشہور خطاطوں نے لکھا ہے۔ ان میں سے بعض مخطوطات تو فنِ خطاطی کا بہترین نمونہ ہیں جب ہندوستان میں پریس آیا تو دیوانِ حافظ بھی طبع ہونا شروع ہوا۔ اب تک دیوانِ حافظ کے لاتعداد اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ چونکہ ہندوستان میں کلام حافظ ہمیشہ مکتبوں، اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل رہا۔ اس لئے اس کے اردو ترجمے بھی خاصی تعداد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اگر ہندوستان میں فارسی کا چلن روز بروز کم ہوتا جارہا ہے۔ دیوانِ حافظ کی اشاعت پہلے سے کہیں زیادہ کم ہو گئی ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اب حافظ پر پہلے سے کہیں زیادہ بہتر کام ہو رہا ہے۔ مثلاً چند برس پہلے ڈاکٹر نذیر احمد اور ڈاکٹر سید محمد رضا جلالی کا مرتبہ دیوان حافظ، دیوان خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی کے نام سے تہران سے شائع ہوا ہے۔ اہل نظر کا خیال ہے کہ یہ دیوانِ حافظ کے مستند ترین نسخوں میں ہے۔ قاضی سجاد حسین نے دیوانِ حافظ مع ترجمہ و حواشی شائع کیا ہے — یہ ترجمہ ہمارے زمانے کی بہت بڑی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔

ہندوستانی مخطوطے کو بھی مرتب کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اگلے اڈیشن میں یہ کمی پوری کردی جائے گی۔

پنڈتا صاحب فارسی کے استاد ہیں۔ اس لئے وہ فارسی کے ایسے الفاظ استعمال کر جاتے ہیں جو اردو میں مستعمل نہیں ہیں یا دوسرے معنوں میں مستعمل ہیں۔ ہم نے دانستہ طور پر ان الفاظ کو نہیں بدلا کیونکہ ممکن ہے ان میں سے بعض الفاظ کو انہیں معنوں میں اردو میں چلن حاصل ہو جائے۔

انجمن ترقی اردو (ہند) نے حافظ کے فن پر اردو کے مشہور ترقی پسند نقّاد سجّاد ظہیر صاحب کی کتاب "حافظ" شائع کی تھی جسے غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔

اب انجمن بڑے فخر کے ساتھ حافظ کے سوانح پر کے۔ این۔ پنڈتا کی یہ کتاب پیش کر رہی ہے۔

خلیق انجم
جنرل سکریٹری
انجمن ترقی اردو ہند

اس سلسلے کی تیسری کڑی ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی تصنیف "حافظ اور اقبال" ہے۔ جو پچھلے سال غالب اکیڈمی سے شائع ہوئی ہے اس کتاب میں دو عظیم فنکاروں کے فن کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ اور دونوں میں مماثلت اور اختلاف کو بڑی بصیرت اور جامعیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ کے۔ این۔ پنڈتا یہ کتاب بھی حافظیات میں ایک اہم اضافہ ہے۔ اردو میں حافظ کی شاعری پر تنقیدی خیالات کا اظہار تو بہت کیا گیا ہے۔ لیکن اس عظیم فنکار کے سوانح بالکل نظرانداز کر دیئے گئے علامہ شبلی نے شعرالعجم کے دوسرے حصے میں حافظ کے جو حالات زندگی لکھے تھے ان میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکا۔ محققین اور ناقدین گھما پھرا کر وہی باتیں کہتے رہے جو علامہ شبلی نے کہیں تھیں۔ اس لئے غلط نہ ہوگا اگر میں یہ کہوں کہ حافظ کے سوانح پر اردو میں کے۔ این۔ پنڈتا صاحب کی یہ پہلی کتاب ہے۔ کسی موضوع پر اگر پہلی بار قلم اٹھایا جائے تو آخر کچھ نہ کچھ خامی رہ جاتی ہے جسے لبعد میں آنے والے دور کرتے ہیں۔ مگر اس کتاب میں ایسی خامی کی گنجائش اس لئے نہیں ہے کہ پنڈتا صاحب نے تہران میں رہ کر حافظ پر کام کیا ہے۔ انہوں نے حافظ کے سوانح کے بارے میں اولین ماخذوں اور ایرانیوں کی تحریروں سے براہ راست استفادہ کیا ہے۔ نہیں اس موضوع پر ایران کے عالموں سے بھی صلاح مشورے کا موقع ملا ہے۔

اس کتاب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ پنڈتا صاحب نے حافظ کی شخصیت کو ایران کے تاریخی، تہذیبی، سماجی، اور سیاسی حالات کے پس منظر میں پیش کیا ہے۔ اگر یہ کتاب شروع سے آخر تک پڑھی جائے تو حافظ اور ان کے زمانے کی مکمل تصویر ہمارے ذہن نشین ہو جاتی ہے۔

کتاب کے شروع میں حافظ کے سوانح کے متعلق اہم اور مستند تذکروں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اور دیوان حافظ کے قدیم ترین مخطوطات کی فہرست بھی دی گئی ہے۔ اس فہرست میں ہندوستان کی لائبریریوں میں محفوظ مخطوطات شامل ہونے سے رہ گئے ہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے دیوان حافظ کے ایک

پیش گفتار

حافظ شیرازی پر اس تحریر سے قبل بہت کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن کوئی تحریر کسی دوسری تحریر کی جیسی نہیں ہو سکتی۔ سوائے اس کے کہ نقل محض ہو۔ ہر حقیقی تصنیف اپنے مصنّف کے زاویۂ نظر کی حامل ہوتی ہے، اس لیے اس کی انفرادیت بھی باقی رہ جاتی ہے۔ سوال صرف اتنا ہے کہ اس زاویۂ نظر کی وسعت کہاں تک ہے، جو مصنف اپنی تصنیف کے ذریعہ پیش کرتا ہے۔

دنیائے ادب و فن میں کوئی بات حتمی یا حرف آخر کی حیثیت نہیں رکھتی۔ یہی وجہ ہے کہ گلزار تحقیق و تصنیف کبھی ویران یا بے رنگ نہیں ہوا۔ ہر سنجیدہ لکھنے والے کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ جو کچھ وہ لکھے وہ کہی ہوئی بات کا عین اعادہ نہ ہو۔ مگر بعض وقت چند باتوں کا اعادہ لازمی سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً تاریخی اور سوانحی پس منظر جو ہر صاحبِ فن کی نشو و نما میں چاہے وہ جذباتی ہو یا ذہنی، نہایت اہم رول ادا کرتا ہے۔ بعض اوقات ایسے صاحب الرائے حضرات کے اقوال کا ذکر ضروری ہوتا ہے جو شاعر یا ادیب سے متعلق خواص و عوام کے ردّ عمل کا تعیّن کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں صاحبِ کتاب کی دونوں باتیں اہم ہو سکتی ہیں چاہے وہ روایتی نقطۂ نظر کے اتفاق میں ہوں یا اعتراض میں۔ مگر اس کی

تاریخ اور تمدن کی روشنی میں زبان اور ادب کا یا ایک بڑے شاعر کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، یہ کتاب اس سلسلہ کی ایک کڑی ہوسکتی ہے۔

ایران کی تاریخ سات ہزار سال سے بھی زیادہ پرانی ہے۔ انسانی تاریخ کے ارتقار میں اس ملک کا نہایت اہم مقام رہا ہے۔ حافظ۔ سعدی، اور خیام جیسے عظیم شاعروں یا ادیبوں کا مطالعہ ایک فرد کا مطالعہ نہیں، بلکہ انسانی تاریخ کے ایک باب کا مطالعہ ہے، اس لیے فرد کو زمانہ سے الگ کر کے پرکھنے کا جو اصول ہمارے یہاں رائج تھا وہ اب ختم ہو رہا ہے اور ماضی کے خسارہ کی تلافی کا وقت ہے۔ زمانہ بہت بدل گیا۔ جو رُکے گا کھو جائے گا۔ جدید میکانکی چھاپے خانے اور رسل و رسائل، حمل و نقل اور مواصلات کے برقی ذرائع سب ہماری خدمت کے لیے کمربستہ ہیں۔ ایرانیوں نے گزشتہ پچاس برس میں ان سہولیات کا بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ مادی پیشرفت کے ساتھ انھوں نے اپنے علمی اور ادبی خزانوں کو بازیاب کرنے اور اہم ادبی شخصیتوں کو موثر طریقہ پر روشناس کرانے میں بڑے کارنامے انجام دیے ہیں۔

۱۹۶۰ سے ۱۹۶۲ء تک تہران یونیورسٹی میں کسب علم کے دوران مجھے کئی کتاب خانوں میں جاکر کچھ ایسے نادر قلمی نسخوں کو دیکھنے کا موقع ملا جو حافظ شیرازی کے متعلق کچھ نہ کچھ اطلاع بہم پہنچاتے ہیں۔ میں نے اپنے مقصد کو سامنے رکھ کر ان سے ضروری اور مربوط یادداشتیں محفوظ کرلیں۔ اس کے علاوہ تہران یونیورسٹی کے شفیق استادوں کے درسوں میں بھی حافظ اور اس کی شاعری پر جو کچھ معلومات میسر ہوئیں انھیں قلمبند کرلیا۔ واپسی کے بعد سے آج تک جو وقفہ گزرا ہے، وہ بھی اس کتاب کے مندرجات کی ترتیب و تہذیب کے لیے کارآمد رہا۔ کیونکہ حاصل شدہ مواد کے بعد ایران میں چھپنے والے کئی ادبی مجلوں میں حافظ پر بصیرت افروز مضامین شائع ہوئے جن میں استفادہ کیا گیا۔ پہلے خیال تھا کہ ان معلومات کو ایک ہی جلد میں جمع کردوں لیکن نئے مضامین کے مطالعہ نے مجھے اس امر پر مجبور کیا کہ

تحریر کی کامیابی محض اس کے اسلوبِ بیان پر ہی منحصر نہیں ہے بلکہ اس کے مواد کے ساتھ منصفانہ سلوک پر بھی ہے جو اس نے اپنے نقطہ کی تقویت کے لئے جمع کیا ہو۔

موجودہ کتاب ان ہی چند سوالات کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ اس کی ترتیب میں اس امر کو ذہن میں رکھا گیا ہے کہ حافظ شیرازی پر قدیم اور جدید تحریروں سے اہم اجزا اخذ کر کے مناسب مواقع پر پیش کر دیئے جائیں تاکہ پڑھنے والے ان قابل قدر تذکروں اور تاریخوں سے بہ یک وقت استفادہ کر سکیں جن تک ان کی رسائی بے حد دشوار ہے۔

شاعروں اور ادیبوں کی زندگی، اور ان کے ماحول سے متعلق اطلاعات کی بسا اوقات کمیابی اور بعض اوقات نایابی ہر محقق کے لیے ناامیدی کا باعث رہی ہے یہی وجہ ہے کہ اس مایوسی سے بچنے کے لیے قیاس اور گمان کی بھی مدد لینی پڑتی ہے، اور شاید یہ سلسلہ جدید فن تحقیق و تنقید کے باوجود جاری رہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بعض موقعوں پر قیاس و گمان حقیقت سے زیادہ متاثر کر سکتے ہیں۔

ہندوستان میں فارسی زبان اور ادب کو صدیوں تک مقبولیت حاصل رہی یہی نہیں ہندوستانیوں نے اس میں ایسے اضافے بھی کئے جو ایران کے دانشمندوں کی نظروں میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ لیکن عام طور پر ہندوستان میں فارسی ادب اور زبان کی تعلیم ایک کمی کا شکار رہی ہے، جس کی وجہ سے کسی غیر ملکی شاعر یا ادیب کے فن کو ناقدانہ نقطۂ نظر سے سمجھنے میں یہاں کا فارسی داں طبقہ قاصر رہا۔ وہ کمی یہ تھی کہ لوگ ایران کے ہزار سالہ تاریخی اور تمدنی حالات سے بے خبر رہے۔ شاعر اور ادیب کو سمجھنے کے لیے اس کے ملک کی تاریخ اور اس کے ماحول اور سماجی حالات کو پہلے جاننا لازمی ہے۔ زبان کے اصول اور قواعد کو ہی جاننا کافی نہیں، یہی غلط فہمی انگریزی ادب کے بارے میں بھی رہی ہے۔ اب بھی ہمارے یہاں ایسے لوگ ہیں جو زبان اور ادب کو ایک ہی چیز تصور کرتے ہیں اور زبان کو ادب کے ذریعے سیکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتے، اور اسی لیے

پہلا باب

شیراز:

ایران پر عربوں کے حملے کے بعد شیراز کے جغرافیا اور تاریخ کے بارے میں تو ہمارے پاس اطلاعات کا ایک ذخیرہ موجود ہے، لیکن لفظ شیراز کی اصل اور اس کی مختلف صورتوں کی واقفیت کے لیے ہمیں اسلامی دور سے پہلے کے مآخذوں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ یہ مآخذ یا تو کافی نہیں یا بہت سارے ہماری دانست و دسترس سے باہر ہیں۔ شیراز سے کچھ دوری پر ہخامنشیوں کا قدیم اور عظیم پایتخت "تخت جمشید" ہے، جسے... یونانی مورخ ہرودوٹس "Herodotus" نے پرسی پولس (Persepolis) کا نام دیا ہے۔ یہاں کے کھنڈرات میں کھدائی اور تحقیق کے دوران مٹی کی کچھ تختیاں ہاتھ لگی ہیں، جو قدیم شاہنشاہوں نے اپنے خزانوں یا دفترخانوں میں محفوظ کروائی تھیں، ان تختیوں پر ایلامی زبان میں کچھ عبارت درج ہے، جسے گزشتہ برسوں میں پڑھنے اور ثبت شدہ نقوش کو سمجھنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ یہ قابل قدر خدمات امریکا میں شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر کیمرون نے انجام دی ہیں۔ ان میں ایک تختی

میں اسے دو جلدوں میں تقسیم کر دوں۔ پہلی جلد جو اس وقت آپ کے زیرِ مطالعہ ہے، حافظ کی زندگی، اور اس کے عہد کی تاریخ کا غالباً ایک تسلی بخش جائزہ ہے، دوسری جلد جو کچھ عرصے سے زیرِ ترتیب ہے، حافظ کی شاعری کے ناقدانہ جائزہ پر مشتمل ہوگی۔ اُمید ہے کہ دوسری جلد مناسب وقت پر شائع ہو سکے گی۔

اِس کتاب کی تیاری کے سلسلے میں کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی کے سابق لکچرار جناب محمد آفاق صدیقی صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مسودہ کے اوراق کو غور سے پڑھنے کی طویل زحمت اُٹھائی اور مجھے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ اُن کے علاوہ میں ایران اور ہندوستان کے مختلف کتابخانوں کے متصدیوں کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے اس کام میں میرا ہاتھ بٹایا۔

لیکن جن مسکوکات، کھنڈرات اور کھدائی سے دستیاب شدہ چیزوں کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ شیراز کی تاریخ سات ہزار سال پرانی ہو سکتی ہے، اور بقول استاد سعید نفیسی (در مکتب استاد) یہ شوشش، پازالہ گاد اور تخت جمشید کی تاریخی قدامت سے کسی طرح کم نہیں۔

البتہ کلمۂ شیراز کے ریشہ اور ماہیت کے بارے میں اور بھی کئی رائیں ہیں۔ مثلاً بارتھالڈ (BARTHOLD) نے استخر کی تفصیلات درج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ لفظ "شیر + از سے بنا ہے جس کے معنی شیر کے شکم ہیں۔ اس کے لیے عربی میں "جوف الاسد" کی ترکیب لائی گئی ہے۔ بارتھالڈ کا کہنا ہے کہ چونکہ گرد و نواح سے وارد ہونے والی کھانے پینے کی تمام اشیاء شہر کی بڑی آبادی فوراً صرف میں لاتی تھی، اس لیے اس کا نام "شکم شیر" پڑا۔ بارتھالڈ کی اس اطلاع کا ماخذ دراصل مجمل التواریخ ہے، جو ملک الشعراء بہار کی تصحیح کے ساتھ تہران میں چھپی ہے۔ ایک اور قیاس یہ ہے کہ "شیر + آز بمعنی بیشۂ شیر ہے۔ چونکہ آب و ہوا کے لحاظ سے شیراز معتدل اور خوشگوار ہے اور جنگلات اور روئیدگی بکثرت ہے، اسی وجہ سے اس کا نام شیراز پڑ گیا۔

مجلہ یغما کے شمارہ ۳ مورخہ ۱۲ خرداد ۱۳۳۸ میں جمشید سروشیان نے "اشتقاق واژہ ہای برخی از شہرہای ایران" کے تحت ایک مقالہ میں لکھا ہے کہ شیراز دراصل "شہر راد" تھا۔ اس کا قول ہے کہ "شیر" پہلوی زبان کے کلمہ "شتھر" کی بگڑی ہوئی صورت ہے، جس کے معنی شہر کے ہیں اور اوستا کا کلمہ "رازا" پہلوی زبان میں "راز" بن جاتا ہے۔ اس لیے شیراز کے معنی "شہر راز" کے ہیں۔ اس کی توضیح دیتے ہوئے صاحب موصوف نے لکھا ہے:

"چونکہ قدیم زمانے میں یہاں اہم سرکاری کاغذات اور دستاویزات محفوظ کیے جاتے تھے اور کتبخانے بھی دایر تھے اس لیے اس کا نام شہر راز اور بعد میں شیراز پڑا۔"

ھخامنشی خاندان کے بادشاہ داریوش سے متعلق ہے جو ۵۱۶ ق م کی بتلائی جاتی ہے۔ اس تختی پر ایک لفظ "تی رازی ایش" کی صورت میں درج ہوا ہے۔ چنانچہ محققوں کے نزدیک لفظ شیراز کی قدیم ترین صورت یہی ہے، اور علم اللغہ کے اصولوں کے مطابق اس کا شیراز میں تبدیل ہونا ممکن ہے۔ مٹی کی مذکورہ بالا تختی بظاہر اُن مزدوروں کی اُجرتوں کا حساب کتاب ظاہر کرتی ہے جو خشایارشا کی طرف سے شیراز میں کسی تعمیری کام کے سلسلہ میں دی گئی تھیں۔ تختی پر ثبت متن کا فارسی ترجمہ یوں ہو سکتا ہے:

"ارتحمایہ وہوش خزانہ دار پارس گذارش میدہد، ۳ کارشاو تک شکل و ربع شکل نقرہ معادل نصف مزد کار یگرا یسکہ باکوراداکہ عنوان سرکاری صد نفر را در "تی رازی ایش" دارد کار ایشاں است"۔

البتہ کلمہ "تی رازی ایش" کے معنی ابھی تک معلوم نہ ہو سکے۔ تہران یونیورسٹی میں پہلوی کے استاد ڈاکٹر صادق کیا نے مجھے بتایا کہ ان الواح پر ایسے کئی کلمات ہیں جن کے معانی ابھی تک سمجھ میں نہیں آتے۔

شیراز کے مشرق میں قصر ابو نصر کے مقام پر ایک امریکی تحقیقی وفد نے کچھ ایسی چیزیں دستیاب کی ہیں جن سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ شیراز کا شہر ھخامنشی خاندان کے بادشاہوں کے عہد میں اپنی پوری عظمت سے آباد تھا، قصر ابو نصر میں کھدائی کا کام میٹروپولٹین میوزیم شکاگو کے کارشناسوں کے ذریعہ انجام دیا گیا، جن میں ڈاکٹر اوپن (Upham) کی تحقیقات بڑی قابل قدر ہیں۔ اس تحقیقاتی جماعت نے اپنی کاوش کے دوران کچھ ایسے مسکوکات اور دیگر اشیا دستیاب کی ہیں جو سلوکی، اشکانی اور دیگر قدیم تاریخی ادوار سے مربوط ہیں اور جن سے شیراز کی اہمیت اور شہرت کا کچھ پتہ چلتا ہے۔ ان میں کچھ سکّے ایسے ہیں جن پر اردشیر خرہ (اردشیر خرہ) کے ساتھ شیراز کی شبیہہ کا نام آیا ہے۔ یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی ہے کہ قدیم تاریخ کے کس دور میں شیراز فارس کا پایہ تخت رہا

ڈوری پر واقع ہے۔ شیراز کا میدان دراصل گرم سیر اور سرد سیر دو متضاد منطقوں میں واقع ہے۔ اس لحاظ سے یہاں کی آب و ہوا سردیوں میں نہ سخت سرد ہے اور نہ گرمیوں میں سخت گرم۔ کم سے کم درجہ حرارت منفی ۳ اور زیادہ سے زیادہ ۳۸ درجہ سنٹی گریڈ ہے۔ شیراز میں سب سے بڑا دن اور سب سے بڑی رات بیس گھنٹہ اور چھ منٹ کے ہوتے ہیں۔ بارش اکثر سردیوں میں مارچ اور اپریل کے مہینوں میں ہوتی ہے۔ البتہ جنوب مغرب یعنی قلات اور خلار جیسے اگلے علاقوں میں کافی سردی ہوتی ہے اور شدید برفباری بھی ہوتی ہے۔

شیراز میں کبھی تو شمال سے ہوائیں چلتی ہیں جنھیں باد شمال کہتے ہیں اور کبھی جنوب مغرب سے جنھیں بادِ غربی کہتے۔ باد شمال کو ہمیشہ دل پسند اور روح پرور خیال کیا جاتا ہے۔ حافظ نے کئی بار باد شمال کا ذکر اسی جذبہ کے تحت کیا ہے ؎

هر صبح و شام قافلهٔ از دعای خیر   در صحبتِ شمال و صبا میفرستمت

؎ بجز صبا و شمالم نمی شناسد کس   عزیز من که بجز باد نیست دمسازم

خواجوی کرمانی نے اسی باد شمال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ شعر کہا ہے:

هر نسیمی که از آن خطه بیاید باد است
خُنک آن باد که از جانب شیراز آید

چونکہ شیراز سرد اور گرم منطقوں کے درمیان واقع ہے اس لیے آب و ہوا کے لحاظ سے وہ تقریباً اُن تمام قدرتی مناظر سے سرشار ہے جو ان دونوں منطقوں میں متصور ہیں، اس لیے شیراز میں سرد علاقوں میں اُگنے والے درخت اور پودے بھی پائے جاتے ہیں اور گرم علاقوں میں اُگنے والے بھی۔ ہوا کی ملائمت اور موسم کے اعتدال کی وجہ سے شیراز میں انواع واقسام کے پھول ہر فصل میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ شیراز گویا ایک گل خانہ ہے جس میں ہر وقت رنگارنگ پھول کھلے ہوئے ہوتے ہیں

سعدی کا یہ شعر اس لحاظ سے پُر معنی ہے:

نہ لایق ظلماتست باللہ این اقلیم   کہ تختگاہ سلیمان بدست وحضرت راز

شیراز کا جغرافیہ:۔

شیراز ایران کے صوبہ فارس کا مرکز ہے۔ فارس کلمہ "پارس" کا معرب ہے اور اوستا میں "پارثو" کی صورت میں آیا ہے۔ اصل کلمہ یونانی مورخوں نے، جن میں ھرودُوٹس (Herodotus) بھی شامل ہے "پرسس" (Persis) کی شکل میں استعمال کیا ہے۔ مغربی ممالک اس کو "پرشیا" (PERSIA) کی صورت دی گئی۔ یونانی اساطیر میں پارس کو جوپیٹر کا بیٹا بتایا گیا جو مینروا (MINERVA) اور مرکوری (MERCURY) کی راہنمائی سے محیّر العقول کام کرتا تھا، اس کی شادی "ڈاینا" (DIANA) کے ساتھ ہوئی۔ جس کا نتیجہ ایک لڑکا ہوا، اور اس کا نام "پرسس" رکھا گیا۔ یونانی اسی "پرسس" کو "پارس" قوم کا بانی خیال کرتے ہیں۔

شیراز کے نواحی تقریباً ایک مستطیل شکل جیسی بناتے ہیں، جس کے اضلاع اُبھرے ہوئے ہوں۔ شیراز تین طرف میں پھیلے ہوئے پہاڑ کی جنوبی ڈھلوان میں واقع ہے، مغرب اور جنوب مغرب میں کوہ دراک اور شمال مشرق سے لے کر جنوب مغرب تک کوہ بمو پھیلے ہوئے ہیں۔ اس مسطح ہوئی ڈھلوان کو شیرازی "جلگاہ" یا "جلگہ" کہتے ہیں جو ۲۹.۳۸ درجہ عرض بلد اور ۵۲،۴۰ درجہ طول بلد کے درمیان واقع ہے۔ اس کا طول ۱۲۰ کلومیٹر اور عرض ۱۲ کلومیٹر ہے۔ کل رقبہ ۱۲۴۴ مربع کلومیٹر ہے۔ اور سطح سمندر سے تقریباً ۱۵۸۵ کلومیٹر کی بلندی پر واقع ہے۔ عام طور پر جلگہ شیراز کے شمالی پہاڑ سے چشمے اُبلتے ہیں۔ جن کا پانی جنوب کی طرف بہ کر ندی کی صورت اختیار کرتا ہے۔

آب و ہوا

جلگہ شیراز کے جنوبی نقطہ سے خلیج فارس زیادہ سے زیادہ ۲۸۰ کلومیٹر کی

مقامی حکومتوں، شاعروں، تاریخ نویسوں اور سیاحوں کے ذریعہ شیراز کو کئی القاب یا عنوانات
سے یاد کیا گیا ہے۔ ان سب کا کم و بیش ذکر بے جا نہ ہوگا۔

قدیم ترین عنوان جس سے شیراز کو یاد کیا گیا ہے "دار الملک" ہے۔ چنانچہ ابن
بلخی نے فارس نامہ کی تالیف کا سبب بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

"... چون مقتضی برائی اعلی سلطان شاهنشاهی لازوال من العمر چنان بود
که پارس طرفی بزرگ است از ممالک محروسه ... و همواره دار الملک و برگاه
ملوک پارس بوده است۔"

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی دور سے پہلے فارس، ایران کے قدیم بادشاہوں
کا اصلی مرکز تھا۔ اسلامی عہد میں چونکہ شیراز صوبۂ فارس کا مرکز رہا ہے، اس لیے اسے
"دار الملک" کا عنوان دیا جانے لگا۔ اور رسم صفوی عہد تک بدستور جاری رہی (۱)
شیراز نامہ میں بار بار کلمۂ "دار الملک" کو شیراز سے پہلے لایا گیا ہے۔ مثلاً آتابک
آبش خاتون، جو اتابک سعد بن ابی بکر اور ترکان خاتون کی بیٹی اور اتابکان سلغر (سعدی
کے ممدوحین) کی آخری فرمانروا تھی، کے زمانے میں سید شرف الدین کی شیراز پر چڑھائی سے
سے متعلق یہ عبارت درج ہے:-

"... با لشکری آراسته بعزم استخلاص دار الملک شیراز از حدود شبانکاره
در حرکت آمد ..."

شاہ عباس دوم صفوی کے زمانے میں ایک فرمان کے تحت "دار الملک" کے عنوان کو "دار العلم"
میں تبدیل کیا گیا۔ غالباً اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ صفویوں نے اپنا دار الخلافہ رسمی طور پر اصفہان
مقرر کیا، اور شیراز صرف ایک علمی اور تہذیبی مرکز کی حیثیت سے باقی رہا، لیکن اس تبدیلی کے

---

(۱) شیراز نامہ تالیف ابو العباس ابی الخیر زرکوب۔ چاپ تہران، ۱۳۱۰ھ

علاوہ ازیں ایک اور خوبی یہ ہے کہ صرف موسم بہار میں نظر آنے والے پرندے یہاں سال بھر باغوں میں چہچہاتے رہتے ہیں۔ اسی بنا پر شیراز کو شہر گل و بلبل کہا جاتا ہے۔

ہوا کی لطافت، آسمان کی صفائی، افق کی کشادگی، سرسبز اور شاداب کھیت اور پہاڑ اس شہر کو عجیب خوبصورتی اور رعنائی عطا کرتے ہیں، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مناظر قدرت کی جلوہ گری غارت گرِ دین و ایمان بنتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نوروز کے دنوں میں ایران کے مختلف مقامات سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ شیراز آ کر یہاں کی سرسبز و شاداب فضا سے لطف اٹھاتے ہیں۔ یہ رسم قدیم زمانے سے چلی آ رہی ہے۔ چنانچہ شیخ سعدی نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے:۔

خوشا تفرج نوروز خاصہ در شیراز — کہ بر کند دل مسافر از وطنش

سعدی اور حافظ دونوں نے بارہا شیراز کی آب و ہوا کی خوبی، صاف و شفاف پانی، اور وہاں کے لوگوں کی فراخ دلی کا ذکر کیا ہے۔

حاجی میرزا حسن فسائی کی ایک نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں جن میں قدرتی حسن کی تعریف کی گئی ہے:۔

فارس را شیراز چوں شیرازہ است — وصف او بی حد و بی اندازہ است

در تموزش دمبدم باد شمال — میوز دگرما شود زو پائمال

در زمستانش سراسر چون بہار — نخ بند و جز بروزی یا چہار

نیست کس گریان مگر ابر بہار — ور کسی افغان کند باشد ہزار

گر بجوشد کس بود خم شراب — ور خروشد کس بود چنگ و رباب

شیراز کے القاب اور عنوانات:۔

اسلامی دور سے قبل مختلف ذرائع سے ہاتھ آنے والے شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ شیراز کا قدیم نام "تی رازی ایش" ضبط ہو چکا ہے۔ تسلط اسلام کے بعد مختلف ادوار کی

بادت بدست باشد اگر دل نہی بہ ہیچ　　　　در معرضی کہ تخت سلیمان رود بباد

۵　دلم از وحشت زندان سکندر بگرفت(۱)　　　　رخت بربندم و تا ملک سلیمان بردم

۵　نقش خوارزم و خیال لب جیحون می بست　　　　با ہزاران گلہ از ملک سلیمان میرفت

۵　بخواہ جام صبوحی بیاد آصف جاہ　　　　وزیر ملک سلیمان عماد دین محمود

شاہ شجاع کی مدح میں قصیدہ میں بھی حافظ نے ایک بار "ملک سلیمان" کی ترکیب استعمال کی ہے:۔

بعد از کیان بملک سلیمان نداد کس　　　　این ساز و این خزینہ و این لشکر گران

ملک سلیمان یا تخت سلیمان کا لقب شیراز کو کیوں دیا گیا۔ یہ بھی بڑی دل چسپ بحث ہے شیراز نامہ میں یہ عبارت درج ہے:۔

"..... ملوک عجم و شہریاران ایران زمین ہر سال یک نوبت درین نقطہ زمین آمدندی گفتندی کہ صومعہ سلیمان درین زمین بودہ است"

اس طرح کی عبارت اور بھی کئی مورخوں کی نگارشات میں دیکھی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شیراز میں یا اس کے آس پاس کوئی ایسی یادگار تھی جس کو سلیمان کا عبادت خانہ جیسے نام سے یاد کیا جاتا تھا، اور اسی مناسبت سے ملک سلیمان اور تخت سلیمان کے عنوان شیراز کے لیے تراشے گئے۔

---

(۱)　تاریخ جدید یزد (احمد بن حسین بن علی الکاتب) میں شہر یزد کے بارے میں لکھا ہے:

"..... و سکندر را زندان ذوالقرنین خواندہ اند چنانچہ مولانائے اعظم شمس الدین محمد الحافظ الشیرازی فرمودہ:

دلم از وحشت زندان سکندر بگرفت

رخت بربندم و تا ملک سلیمان بردم

باوجود شیراز کی علمی اور تمدنی و تہذیبی شہرت میں نہ صرف کوئی کمی ہی نہ آئی بلکہ اُس میں اضافہ ہوا۔

یہ امر مسلم ہے کہ شیراز علما و عرفا کا شہر تھا۔ منگولوں کی تباہ کاری کے بعد خراسان اور دیگر مقامات سے سرکردہ عالم اور فاضل شیراز کی طرف چلے آئے۔ یہاں کئی بڑے مدرسے اور کتاب خانے تھے۔ فرصت نے اپنی کتاب "سند الابرار" میں لکھا ہے کہ:

"..... خالی نیست شیراز ہرگز در ہیچ ساعت از چہار صد و چہل و چہار ولی کہ در پس تراز و ہستند و اجناس می سنجند....."

یہ شیراز کے خدا دوست، راستباز اور نیک نام اہل بازار و کسبہ کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ سعدی نے بھی اس موضوع کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

ہزار پیر و ولی باشد اندر وی　　　که کعبه بر سر ایشان همی کند پرواز

ساتویں صدی ہجری سے کچھ پہلے شیراز کو ایک اور لقب سے یاد کیا جانے لگا، اور وہ ہے "ملک سلیمان"۔ تاریخ وصاف اور شیراز نامہ تقریباً اسی دور کی کتابیں ہیں۔ ان کی عبارات میں یا نقل قول کے وقت بارہا "ملک سلیمان" اور "تخت سلیمان" کو "دارالملک شیراز" کا مترادف لایا گیا ہے، اگرچہ دار الملک شیراز بھی استعمال ہوا ہے۔ صاحب شیراز نامہ نے ملک اشرف کی شیراز سے ہزیمت اور جلال الدین مسعود کے زوال میں یہ شعر کہے:

سپاس و شکر خدا را که میر فرخ بخت　　　خدیو مملکت آرا شهه غریب نواز

بسال هفتصد و چهل باسه در تجمل و ناز　　　به تخت گاه سلیمان رسید دیگر باز

سعدی نے اپنے اشعار میں کئی بار شیراز کو ملک سلیمان اور تخت سلیمان کے عنوانوں سے یاد کیا ہے:۔

؎ نه لایق ظلمانست بالله این اقلیم　　　که تخت گاه سلیمان بدست حضرت راز

حافظ نے بھی اسی لقب کو کئی بار استعمال کیا ہے ؎

تشریح کرتے ہوئے کہا ہے کہ شیراز سلیمان پیغمبر کا پایہ تخت تھا:۔

بخواہ جام لبالب بیاد آصف دہر — وزیر ملک سلیمان عماد دین محمود[1]

اس عنوان کے علاوہ شیراز کو اور بھی کئی ناموں سے یاد کیا گیا ہے مثلاً

(۱) قبۃ الاسلام۔

ہر آن کس کہ کند قصد قبۃ الاسلام — بریدہ باد سرش ہمچو زر و نقرہ بگاز (سعدی)

(۲) دار الفضل

"حسب الامر پدر والا گہرش از دار الفضل شیراز محرک لشکر ظفر طراز گردید۔" (تاریخ گیتی گشا عطا ملک جوینی)

(۳) شہر نیک مرداں:

کہ گوش دار تو این شہر نیک مردان را — ز دست ظالم بد دین و کافر غماز (سعدی)

۴۔ خال رخ ہفت کشور۔

شیراز و آب رکنا و گلگشت خوش نسیم — عیبش مکن کہ خال رخ ہفت کشور است (حافظ)

شاعروں اور منشیوں نے شیراز کو کئی اور لقبوں اور عنوانوں سے یاد کیا ہے۔ مثلاً شیراز جنت طراز۔ شہر گل و بلبل۔ شہر عشق۔ شہر ہنر خیز۔ شہر زندہ دلان وغیرہ۔

تاریخی مقامات

شیراز میں اسلامی دور سے قبل اور بعد دونوں زمانوں کے نادر تاریخی مقامات عمارات اور کھنڈرات اب تک موجود ہیں، ان سب کا تفصیلی ذکر تو یہاں ممکن نہیں، البتہ ہم چند ایسی جگھوں کا تذکرہ کریں گے جو حافظ کے زمانے میں اور اس سے پہلے بھی علمی اور ادبی حیثیت اور اہمیت کے حامل رہے ہیں، اور کسی نہ کسی طرح حافظ کے مطالعہ کے دوران ہماری نظروں سے گزرتے ہیں۔

---

(۱) مشرح سعودی بر حافظ، ترجمہ فارسی عصمت ستارزادہ۔ چاپ تہران ۱۲۶۰/۶۱

مسعودی

فرانسیسی سیاح ٹاورنیہ (TAVERNIER) نے ۱۶۶۵ء میں شیراز کی سیاحت کی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ شیراز کے جنوب مشرق میں شہر سے کچھ دوری پر ایک ٹیلہ پر تین عمارتوں کے کھنڈرات دکھائی دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ عبادت گاہوں کے کھنڈرات ہیں جہاں قدیم زمانے میں ایرانی پرستش کیا کرتے تھے۔ سال ۱۶۷۴ء میں ایک اور فرانسیسی سیاح نے شیراز کی سیاحت کے دوران لکھا ہے کہ:-

شہر سے ایک فرسنگ کے فاصلے پر ایک برج ہے جس کی گولائی ۳۸ سے لے کر ۴۴ ہاتھ تک ہے۔ اس کے دروازے شمال، مشرق اور جنوب کی طرف کھلتے ہیں۔ اس کا مصالحہ سنگ مرمر سے بنا ہوا ہے، اور اس قدر مضبوط ہے کہ بہت وقت گزرنے کے باوجود اس میں رخنہ نہیں پڑا ہے۔ ایرانی اس کو مادرِ سلیمان کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

اس عمارت کی ساخت اور سیاحوں کے بیان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مادرِ سلیمان دراصل کوئی بڑا آتشکدہ تھا، جو اسلامی دور میں ٹھنڈا ہوا، لیکن اس کے مکمل انہدام کو روکنے کے لیے ایرانیوں نے اُسے مادرِ سلیمان کے نام سے مشہور کیا۔ چونکہ حضرت سلیمان پیغمبر کا ذکر قرآن میں آیا ہے اس لیے ممکن ہے ایرانیوں نے عربوں کو اس آتشکدہ یا اس کی عمارت کے انہدام سے باز رکھنے کی ایک زیرکانہ تدبیر نکالی ہو۔

ٹاورنیہ کا قول ہے کہ اس عمارت کے پتھروں پر ایسی کندہ کی گئی صورتیں دیکھی جا سکتی ہیں جن میں ایک انسان ہاتھ میں آگ کے شعلے لیے جا رہا ہے۔

پروفیسر براؤن نے شیراز کو "شہر سبز سلیمان" کے نام سے یاد کیا ہے اور ان کھنڈرات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ مصنف کو بھی سال ۱۹۶۲ء میں ان نواحی کی سیاحت، اور ان کھنڈرات کو دیکھنے کا موقع ملا۔

غزلیات حافظ کے مشہور ترکی شارح ملا سودی نے بھی حافظ کے اس شعر کی

بیت المصحف کو حافظ کے ممدوح شاہ شیخ ابو اسحاق انیجو نے بنوایا تھا اور شیراز کے کئی نامور علمائے دین اسی تاریخی مسجد کے منبر سے وعظ اور خطابہ ایراد کر چکے ہیں۔ اُن میں شیخ روزبہان اور عبداللہ خفیف جیسے عالم بھی شامل ہیں، جن کا ذکر سعدی نے ایک قصیدہ کے دوران ان کی پارسائی اور دینداری کے لحاظ سے کیا ہے ؎

بذکر و فکر و عبادت بروح شیخ کبیر　　بحق روزبہان بحق پنج نماز

شیخ کبیر سے مراد عبداللہ خفیف ہے۔ اسی قدیم مسجد کے زیر سایہ ایک قبرستان ہے جس میں شیراز اور ایران کی کئی مشہور ہستیاں دفن ہو چکی ہیں، ان میں وصال شیرازی اور اُن کے چاروں بیٹے شامل ہیں۔

تنگ اللہ اکبر

تنگ فارسی میں درہ کو کہتے ہیں۔ تنگ اللہ اکبر کو شیراز کے شمال میں کوہ بہوی اور ریحل مقام کے درمیان اصفہان اور یزد سے آتے ہوئے شیراز کا دروازہ سمجھ لیجئے۔ رکناباد کی ندی اسی درہ کے وسط سے گزرتی ہے جس کی بدولت درہ کے دائیں بائیں دُور تک سبزہ زار پھیلا ہوا ہے۔ تنگ اللہ اکبر پر پہنچ کر سامنے کی ڈھلوانوں اور پہاڑوں کے دامن میں شیراز کا افسانوی اور سحر انگیز شہر دکھائی دیتا ہے۔ اس جگہ کا قدرتی نظارہ، ہوا کی طراوت اور اطراف کی شادابی، مسافر کی طبیعت سے تھکنگی اور کسالت کے آثار مٹا دیتے ہیں۔ چنانچہ سعدی کہتا ہے ؎

چہ خوش سپیدہ دم باشد آنکہ بینم باز

رسیدہ بر سرِ اللہ اکبر شیراز

تنگ اللہ اکبر، رکناباد، اور مصلیٰ حافظ کے ان دو اشعار کی وجہ سے لافانی اور زبان زدِ عام ہو چکے ہیں:۔

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت　　کنار آب رکناباد و گلگشت مصلیٰ را

مسجد جامع عتیق :-

شیراز میں اسلامی دور کے قدیم ترین آثار میں مسجد جامع عتیق کا ذکر سب سے پہلے آنا چاہیے۔ سال ۲۸۱ھ میں عمرو لیث صفاری کے حکم سے اس مسجد کی بنیاد ڈالی گئی تھی، چنانچہ ملک الشعرا بہار نے ۱۳۱۲ھ ش میں شیراز کے سفر کے سلسلہ میں ایک قصیدہ "شیراز" کے عنوان سے لکھا تھا جس میں مسجد جامع اور عمرو لیث کی طرف اشارہ ہے:

بر مسجد ویران عمرو لیث	رُخ سای کہ پیر نیست بافرین
رُخ سای بر آن فرخ آستان	بزدای از و گرد باستین
قرآن کدہ اش را درون صحن	با دیدہ قرآن شناس بین

یہ مسجد کئی بار حوادثِ روزگار کے ہاتھوں ویران ہوئی اور از سرِ نو زیرِ تعمیر لائی گئی۔ اس کے صحن کے وسط میں مکعب شکل کی ایک عمارت ہے جس کو "خانہ خدای" "یا بیت المصحف" کا نام دیا گیا ہے۔ "شد الازار" کے مؤلف کا قول ہے کہ "بیت المصحف میں قران کے کئی نسخے اور جزوات ہیں بعضیں اہلِ بیت، صحابہ یا تابعین نے اپنے ہاتھوں سے لکھا ہے، ان میں ایک نسخہ حضرت علیؓ کے خط شریف میں ہے۔ اس کے علاوہ امیر المومنین حسن علی بن الحسین زین العابدین اور امام جعفر صادق کے لکھے گئے نسخہ جات بھی شامل ہیں۔ حضرت عثمانؓ کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ ایام فتنہ میں نایاب ہوا"

(شیراز، تالیف حسن امداد، چاپ تہران ص ۱۳۴)

ڈاکٹر قاسم غنی نے تاریخ عصر حافظ (جلد اول ص ۱۲۱) میں لکھا ہے کہ:

"۷۷۰ھ میں خواجہ جلال الدین تورانشاہ نے قرآن کا ایک نسخہ مسجد عتیق شیراز کو وقف کیا، جسے یحیی الجمالی نے ۷۴۶/۷۴۵ھ میں نہایت نفیس خط ثلث میں لکھا تھا۔ اس وقت اس کے چوبیس جزوات بارہ مجلد میں شیراز کے میوزیم میں محفوظ ہیں۔"

گہوارہ دید کے بارے میں خیال ہے کہ یہ اسلامی عہد میں نگہبانی اور خبر رسانی کے لیے ایک پاسگاہ تھی۔ گہوارہ دید قدیم طرز کے طاقوں والا برج ہے جس کو گہوارہ دیو اور گنبد عضد کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے۔ بعض محققوں کا خیال ہے کہ یہ گنبد آگ، اور دھوئیں کے ذریعہ خبر رسانی کی غرض سے اسلامی دور سے پہلے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے چار طاق، چار سمتوں میں کھلتے تھے، اور جس طرف خبر پہنچانی مطلوب ہوتی تھی، اس طرف کا پردہ اوپر نیچے اٹھاکر آگ کے شعلوں کی علامت سے خبر رسانی کا کام انجام دیا جاتا تھا۔ چونکہ دن میں شعلوں کے ذریعہ خبر رسانی ممکن نہیں تھی اس لیے عمارت کی چھت میں ایک سوراخ کیا گیا تھا جسکو ضرورت پڑنے پر آہنی تختہ سے بند کیا جا سکتا تھا۔ اگر دن میں مخابرہ کی ضرورت پڑتی تو اس آہنی تختہ کو اٹھاکر دھوئیں کو خارج کیا جاتا تھا۔ البتہ اور کئی محقق یہ کہتے ہیں کہ عضد الدولہ دیلمی نے اس گنبد کو اپنی فوج کے لیے پاسبانی کا ٹھکانا بنایا تھا اس لیے اس کو گنبد عضد الدولہ بھی کہتے ہیں۔ سعدی نے بھی ایک حکایت میں اس گنبد کی طرف اشارہ کیا ہے۔

یہ وہی عضد الدولہ ہے جس کو تاریخ میں عضد الدولہ فنا خسرو کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے، اور جس کے عہد میں یعنی ۳۸۲ ہجری میں مشہور عربی شاعر متنبی شیراز آیا تھا اور عضد الدولہ کی مدح میں ۹۴ اشعار کا ایک قصیدہ بھی کہا تھا۔

رکنا باد۔

تہران اور اصفہان سے شیراز کا راستہ تنگ اللہ اکبر سے گزر کر شیراز آ پہنچتا ہے رکن آباد کی ندی اس درہ کو سرسبز اور شاداب بناتی ہے۔ حافظ نے بار بار رکنا باد کا نام لیا ہے، اور اس کی تعریف کی ہے۔ رکن آباد کی قنات یعنی زمین دوز نہر کو رکن الدین دیلمی کے حکم سے ۳۳۸ ہجری میں کھدوایا گیا تھا۔ یہ جو یبار ساتویں صدی ہجری ہی سے بڑی شہرت حاصل کر چکی تھی۔ چنانچہ سعدی نے بھی اپنی غزلوں میں کئی بار اس کا ذکر کیا ہے:

دست از دامنم نمی دارند　　　خاک شیراز و آب رکنا باد

فرق ست ز آبِ خضر کہ ظلمات جای اوست
تا آب ماکہ منبعش اللہ اکبر است

تا آب

تنگ

تنگ اللہ اکبر کی خوبصورتی اور تسمیہ بیان کرتے ہوئے پروفیسر ایڈورڈ براؤن نے اپنی کتاب A YEAR AMONG PERSIANS میں لکھا ہے:

جونہی میں اصفہان، شیراز کی شاہراہ کے ایک زاویہ سے گزرا اچانک میری آنکھوں کے سامنے ایک ایسا منظر آیا جو ہرگز فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ میں عمر بھر اس لیے نہیں فراموش کر سکتا کیونکہ میں نے زندگی میں اس سے پہلے کبھی ایسا پر اثر منظر نہیں دیکھا تھا، یعنی شیراز اور اس کے اطراف وہ خاص نقطہ جو میری آنکھوں کے سامنے تھا اور جس کو سب ایرانی اور حافظ کے شناسا اچھی طرح جانتے ہیں تنگ اللہ اکبر کہلاتا ہے، جب مسافر کی نظر اس جگہ سے دور شیراز کی گودی پر پڑتی ہے، وہ اس کی خوبصورتی سے اتنا متاثر ہو جاتا ہے کہ فرط حیرت و تحسین سے بے اختیار "اللہ اکبر" پکارتا ہے۔

تنگ اللہ اکبر کے آس پاس کچھ تاریخی آثار دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان میں گہوارہ دید اور چاہ مرتاض علی قبل از اسلام دور سے تعلق رکھتے ہیں اور دروازہ قرآن، گنبد عضد (گہوارہ دید) آرامگاہ خواجوی کرمانی۔ مشرقی۔ قنات رکناباد۔ خرابۂ خلعت پوشان اور آرامگاہ عماد الدین محمود، بعد اسلام دور سے۔ اس مقام پر قبل از اسلام دور کے اور بھی کئی آثار کی نشاندہی کی جاتی تھی، جو اب نیست و نابود ہو چکے ہیں۔ مرتاض علی اور گہوارہ دید تنگ اللہ اکبر کے بائیں طرف واقع ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ چاہ مرتاض اگلے وقتوں میں ایک اہم آتش کدہ کی جگہ تھی جسے اسلامی دور میں ڈھایا گیا عام شیرازیوں کا خیال ہے کہ اسی چاہ مرتاض علی کے نزدیک حافظ پر ذیل کی غزل کا نزول ہوا تھا ؎

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند   وندران ظلمت شب آب حیاتم دادند

مصلیٰ است مدفون گردید۔"

ساتویں صدی ہجری کا نامور عالم فخرالدین ابو عبداللہ معروف بہ ابن ابی مریم شیرازی بھی گورستان مصلیٰ میں دفن ہے، تیرھویں صدی عیسوی کا ایک اور عالم قطب الدین محمد بھی اسی گورستان میں دفن ہوچکا ہے۔

مصلیٰ یا خاک مصلیٰ (بعض اوقات صحرای مصلیٰ) موجودہ دروازۂ اصفہان، اور شاہ میر علی بن حمزہ کے بقعہ سے شروع ہوکر کوہ چہل مقام کے دامن تک پھیلا ہوا ہے۔ کچھ سال پہلے علی بن حمزہ کے بقعہ، جو اس وقت ہنرستان کی جگہ ہے اور جس کے ساتھ اس وقت کا باغ ملّی اور وسیع اطراف ہیں، جن میں حافظیہ بھی شامل ہے، کے نزدیک جوان آباد سب قبرستان تھا اور اب بھی وہاں پر قبریں موجود ہیں۔ خاک مصلیٰ کے شمال میں خواجہ حافظ کی آرام گاہ قرار پائی ہے۔ لیکن یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ مصلیٰ کے وسیع اطراف میں صرف قبرستان ہے اس کے شمال اور مغربی حصوں میں قبرستان نہیں تھے، بلکہ نہایت سرسبز اور شاداب ڈھلوان تھی جس میں رکنا باد کی ندی بہتی ہے۔ مصلیٰ کی اہمیت اس لیے ہے کہ خواجہ حافظ کی آرامگاہ اسی جگہ پر واقع ہے۔ اس کی تاریخ وفات خاک مصلیٰ کی ترکیب سے نکالی گئی ہے، اگرچہ اس میں تردید کی گنجائش باقی ہے۔

استاد علی اصغر حکمت نے اپنی تالیف " از سعدی تا جامی"، کے صفحہ ۲۰۸ کے حاشیہ پر خاک مصلیٰ کے بارے میں یہ عبارت لکھی ہے:

" ... خاک مصلیٰ دشت وسیع و صفا و طرب انگیزی است کہ در دامند کوہ چہل مقام شمال شیراز قرار دوی کی از مناظر بسیار با نزھت کشور ایران است و مورد ستایش خواجہ شیراز بودہ و در وصف آن گفتہ است"

بدہ ساقی می باقی کہ در جنت نخواہی یافت   کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلیٰ را

پروفیسر براؤن نے لکھا ہے کہ مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ میں اس نہر کے سرچشمہ پر پہنچا جس کو حافظ نے جاوید ان کر دیا ہے۔

رکنا باد کا سرچشمہ شیراز کے شمال میں آدھ فرسنگ کے فاصلہ پر کوہ بمو میں ہے اور تنگ اللہ اکبر کے مدخل سے اس قنات کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اکبر آباد نام کے گاؤں کو بھی یہی جویبار سیراب کرتی ہے۔ جغرافیا اور تاریخ کی کتابوں میں اس نہر کے پانی کی بڑی تعریفیں ملتی ہیں

فارس نامہ میں درج ہے کہ حکما اور اہل طب نے رکنا باد کے مجموعی صفات اور اس کی خاصیتوں کے بارے میں چھ باتوں کا ذکر ہے:

(۱) اس کا منبع دوری پر ہے (۲) ندی مکشوف راہوں سے گزرتی ہے۔ (۳) اس کا پانی سنگریزوں اور پتھروں پر سے گرگرا آتا ہے (۴) اس میں کسی قسم کے جراثیم یا حشرات موجود نہیں (۵) اس کے کنارے پر کوئی ایسا درخت نہیں جو پانی کے مزاج میں تبدیلی کا باعث بنے (۶) اس کا پانی اونچائی سے اچھل کر نیچے گرتا ہے۔ ایسا پانی مزاج اور ہاضمہ کے لیے لطیف ہوتا ہے۔ (فارس نامہ ناصری تالیف حسین زرکوب)

مکشوف

مصلیٰ:-

مصلیٰ کو حافظ نے جاودانی بخشی، چنانچہ:

بدہ ساقی می باقی کہ در جنت نخواہی یافت　　کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلیٰ را

مصلیٰ شیراز کے شمال میں کوہ چہل مقام کی ڈھلوان میں ایک وسیع قطعۂ زمین ہے جو قدیم زمانے میں قبرستان کے لیے وقف ہو چکا تھا۔ چنانچہ حسن امداد کی تالیف "شیراز در گزشتہ و حال" کا یہ جملہ اس مقولہ کی تصدیق کرتا ہے:

"..... در ہمیں محل کہ امروز بنام قبر شاہ شجاع در قسمت شمال گورستان

ہمیں

سے ایک بدنما محلہ میں تبدیل ہوئی ہے۔ بے انصاف لوگوں کی ایک جماعت نے قبرستان کی زمین پر ناہنجار قسم کی عمارتیں بناکر اس دلکش منظر کو قبیح بنا دیا ہے اور اس زمانے کے لوگوں نے شیراز کو بے ادبی و فقدان لطف و ذوق میں شہرۂ عام کر دیا ہے۔ سب سے بدتر یہ کہ سیکلو نام کی ایک بدنما اور بدترکیب نہر کے بنانے سے ادب و صفا کی اس بزم گاہ کو اور بھی مکدر بنایا ہے۔ اب اس جگہ ایک بدزیب اور بدنما منظر وجود میں آیا ہے جو ان کی بد ذوقی کی صاف دلیل ہے۔ افسوس، ہزار افسوس!!

حافظیہ یا آرام گاہ حافظ۔

حافظ کو خاک مصلیٰ سے بڑی محبت تھی، چنانچہ وفات کے بعد اس کے جسد خاکی کو اسی مصلیٰ میں ایک سرو کے نیچے سپرد خاک کیا گیا۔ یہ جگہ اب حافظیہ کے نام سے مشہور ہے۔ ابوالقاسم بابر نام کا ایک تیموری شاہزادہ ۸۵۶ ہجری میں فارس کا حکمران بن کر شیراز آیا۔ اس کے حکم سے اس کے اُستاد اور وزیر مولانا شمس الدین محمد معمائی (بقول صاحب شیراز نیمائی) نے حافظ کی آرامگاہ پر ایک مقبرہ بنوایا جو ایک گنبد اور ایک عمارت پر مشتمل تھا۔ اس کے سامنے ایک بڑا حوض بھی بنوایا گیا جس کو رکنا بادی ندی کے پانی سے بھرا جاتا تھا۔ اس سلسلہ میں میر علی شیر نوائی نے اپنے تذکرۂ مجالس میں یہ عبارت لکھی ہے:

"...... مولانا محمد معمائی در زمان بابر میرزا صدر معظم گردید...... ودر ایام مکنت خود در شیراز در سر تربت خواجہ حافظ گنبدی ساخت و بابر میرزا آنجا ضیافت کرد امّا یکی از خوش طبعان شیراز بہ جانبی کہ نظر بہ میرزا افتد این بیت را نوشتہ بود۔

اگرچہ جملہ اوقات شہر غارت کرد ۔۔۔ خدایش خیر دہاد کہ این عمارت کرد

گیارھویں صدی ہجری کے اوائل یعنی شاہ عباس صفوی کے عہد سے اس عمارت

خاک مصلی جایگاہ مزار بسیاری از بزرگان و معارف بودہ است و دو تکیہ و خانقاہ بزرگ در آن جا بنام "ہفت تنان" ہنوز باقی باشد"۔ تکیہ ہفت تنان کے بارے میں ہماری جانکاری دلچسپی سے خالی نہیں۔ یہ جگہ بھی کوہ چہل مقام کے دامن میں واقع ہے اور اس کی عمارت کو کریم خان زند نے بنوایا تھا۔ اس کے ایک ایوان کی دیوار پر پانچ تصویریں منقش کی گئی ہیں، جن کے بارے میں لوگوں کا عقیدہ ہے کہ بالترتیب یوں ہیں:

(۱) شاہ شیخ ابو اسحاق اور حافظ۔

(۲) حضرت موسیٰؑ شبانی کرتے ہوئے۔

(۳) حضرت ابراہیمؑ اپنے بیٹے کی قربانی دیتے ہوئے

(۴) شیخ صنعان اور دختر ترسا

(۵) سید معصوم علی شاہ یا شیرازیوں کے مطابق شیخ سعدی۔

اس تکیہ میں سات گمنام عارفوں کی قبریں بھی ملتی ہیں، لیکن ان میں کسی کے بھی سنگ مزار پر کوئی عبارت کندہ شدہ دیکھی نہیں گئی ہے۔

خواجہ حافظ کی کوئی مستند یا غیر مستند تصویر آج تک نہیں پائی گئی۔ شاہ ابو اسحاق کے ساتھ حافظ کی تصویر لوگوں کی کہی سنی بات ہے۔ اس کی صحت کے بارے میں ہمارے پاس کوئی سند نہیں۔

خاک مصلی پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے استاد علی اصغر نے اپنے وقت یعنی ۱۳۲۰ ہجری شمسی میں خاک مصلی میں رہائشی اور سرکاری عمارات کی تعمیر سے اس خوبصورت خطہ میں رونما ہوئی بے رونقی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"افسوس یہ خوشنما جگہ جو کئی صدیوں سے ارباب ذوق اور رندان جہان کی زیارت گاہ رہی ہے اور ایران کے نزہت انگیز مناظر میں سے ہے۔ اب فارس میں حاکم وقت کی لاتعلقی اور نادانی سے اور رئیس بلدیہ کی بے ذوقی

شیعیہ ہونے کی بحث کے ضمن میں اِس غزل کو پیش کیا ہے۔

استاد علی اصغر حکمت نے "سعدی تا جامی" کے صفحہ ۳۶۷ کے حاشیہ پر تذکرہ میخانہ کے حوالہ سے حافظ کے شعیہ ہونے کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں ایک مشہور داستان کو درج کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے:

"جب حافظ ابتدائی دور میں ناموزوں شعر کہنے کی بنا پر مایوس ہوا تو ایک بار عالمِ یاس میں باباکوہی کے آستانہ پر پہنچا۔ وہاں تین دن تک پڑا رہا، اور افطار تک نہ کیا۔ دن رات تضرّع و زاری کرتا رہا تیسری رات گریہ و زاری ہی کی حالت میں تھا کہ آنکھ لگ گئی۔ خواب میں ایک سوار کو دیکھا، جس کے گھوڑے کے نعل سے لے پیشانی تک نور ہی نور تھا، اُس نے اپنا مبارک چہرہ حافظ کی طرف کرکے کہا ـ "اے حافظ اُٹھ! تیری مراد ہم نے پوری کردی۔ پھر ایک نہایت سفید لقمہ اپنے مبارک دہن سے نکال کر حافظ کے منہ میں ڈالا، اور فرمایا کہ ہم نے تم پر علم کے دروازے کھول دیے۔ فصاحت و بلاغت میں تمھیں زمانے کا نادرانسان بنایا۔ لوگ تمھارے اشعار کو ہاتھوں ہاتھ لیا کرینگے۔ تم روزِ ابد تک صفحہ ہستی پر بطور یادگار باقی رہو گے۔"

خواجہ حافظ نے کہا میں نے زندگی بھر کبھی اتنا لذیذ لقمہ نہیں کھایا اور نہ اس قدر ذوق حاصل کیا تھا جو اس لقمہ سے مجھے حاصل ہوا۔ پھر وہ خورشید تاباں غائب ہونے لگا۔ میں اس کے سامنے گیا۔ یکایک مجھے ایک نیک سیرت و خوش صورت بزرگ نظر آیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ نیر اعظم کہاں سے طلوع ہوا، اور اس کا اسم مبارک کیا ہے؟ اس نے کہا، عجب! کیا تم نہیں جانتے یہ ساقی شراب طہور ہے، یہ وہی شخص ہے جس کی شان میں حضرت رسالتمآبؐ نے

فرمایا ہے "انا مدینۃ العلم و علی بابھا"۔ میں شوق سے اُٹھ کھڑا ہوا، تا کہ اُن کے پاک قدم لوں، اور سر اور جان کو امیر مردان پر نثار کردوں۔ مؤذن کی آواز کان میں پڑی

میں تعمیر اور ترمیم ہوتی رہی، لیکن اصلی عمارت کو ۱۱۸۹ہجری میں کریم خان زند کے حکم سے بنوایا گیا۔ اس کی بنوائی ہوئی عمارت میں اس زمانے کے ہنر کا خاص طریقہ اور طرز پیش نظر تھا۔ قبر پہ سنگ مرمر کی ایک بڑی خوبصورت سل نصب کردی گئی تھی جو اب تک برقرار ہے۔

اس سل پر حافظ کی درج ذیل دو غزلیں نہایت عمدہ نستعلیق میں کندہ کرائی گئی ہیں:

(۱)

ایدل غلام شاہ جہاں باش شاہ باش پیوستہ در حمایت لطف الٰہ باش

(۲)

مژدۂ وصل تو کو کز سر جان برخیزم طایر قدسم واز سر دو جہان برخیزم

حافظیہ پر مزید تفصیل درج کرنے سے پہلے مندرجہ بالا غزل نمبر ۱ یعنی ایدل .... الخ پر کچھ دلچسپ اطلاع کا درج کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے:

خاندان صفوی کے بانی شاہ اسماعیل نے جب ایران میں مذہب تشیع کو سرکاری مذہب قرار دیا تو کچھ متعصب لوگوں کے اثر میں آکر وہ آمادہ ہوا کہ ایک حکم نامہ جاری کرے جس کی رو سے شیراز میں حافظ کے مقبرہ کو مسمار کیا جائے، کیونکہ یہ لوگ حافظ کو سنّی خیال کرتے تھے اور اس کے دیوان کے پہلے شعر "الا یا ایہا الساقی ادر کاساً وناولہا" کو بطور سند پیش کرتے تھے جو دراصل یزید بن معاویہ کا مصرعہ ہے۔ چنانچہ حکم نامہ جاری ہوا اور غالباً مقبرہ کے کچھ حصوں کو منہدم بھی کر دیا گیا، لیکن (جیسا کہ کئی تذکرہ نویسوں نے تصدیق کی ہے)، شاہ اسماعیل صفوی نے دیوانِ حافظ سے فال نکالی، اور بشارت ملنے پر اس عمل سے منحرف ہوا۔ شعر یہ تھا ؎

جوزا سحر نہاد حمایل برابرم یعنی غلام شاہم و سوگند میخورم

بعض محققوں کا خیال ہے کہ زیر بحث غزل یعنی "ایدل غلام شاہ..." حافظ کی نہیں۔ دانشمند محترم حسین پژمان نے اس کو حافظ کی ان غزلوں میں شامل کیا ہے جن کے بارے میں شک اور تردید کی گنجائش ہے۔ ہاشم رضی نے حافظ کے

امروز زنده ام بولای تو یا علی — فردا بروح پاک امامان گواه باش

قبر امام هشتم سلطان دین را — از جان ببوس و بر در آن بارگاه باش

دستت نمیرسد که بچینی گلی ز شاخ — باری بپای گلبن ایشان گیاه باش

مرد خدا شناس که تقوی طلب کند — خواهی سپید جامه و خواهی سیاه باش

حافظ طریق بندگی شاه پیشه کن

وآنگاه در طریق چو مردان راه باش

ہاشم رضی نے مقدمہ دیوان حافظ میں (صفحہ ۱۰۵) حافظ کے مسلک پر بحث کرتے ہوئے علی دشتی کی رائے (نقشی از حافظ) سے اتفاق کیا ہے اور غزل زیر بحث کو حافظ کی غزل نہیں مانا ہے۔ اُس کا قول ہے کہ بہت سی دوسری غزلوں، اور کئی افسانوں کی طرح یہ بھی حافظ سے منسوب کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں اس غزل میں کہیں بھی حافظ کی مخصوص روش کا نشان نہیں ملتا، بلکہ غزل نے روضہ خوانی کی شکل اختیار کی ہے اور یقینی طور پر اُس زمرہ کے اشعار میں سے ہے جو مدح گو منبر پر چڑھ کر پڑھتے ہیں۔ یہ کلام نہ محتشمانہ ہے اور نہ اس میں حافظ کی مخصوص چاشنی، اور گہرائی ملتی ہے جن سے علائق اور تعصبات بشری الگ ہو چکی ہو۔

اسی ناقد نے آگے چل کر لکھا ہے کہ ایسے اور اس طرح کے کئی اور اشعار حافظ کے ساتھ اس لیے منسوب کیے گئے ہیں کہ اُس کو اہل تشیع سے مانا جائے، اور یہ کام ایسا ہی بے ہودہ ہے کہ چند ایک اشعار کی بنا پر حافظ کو اہل سنت سے نسبت دی جائے۔ چنانچہ موخرالذکر قسم کے غرضمند لوگ عام طور پر حافظ کے سنّی ہونے میں یہ شعر پیش کرتے ہیں:۔

من همان دم که وضو ساختم از چشمهٔ عشق

چار تکبیر زدم یکسره بر هر چه که هست

چنانچہ مذہب تشیع میں مردہ پر پانچ تکبیر پڑھی جاتی ہیں اور مذہب سُنّی میں صرف چار۔ اس دلیل کو رد کرنے والوں نے شعر کی تشریح یوں کی ہے:

خواب سے بیدار ہوا، اور باطن کو اس فایض الانوار کے دیدار اور قدم مبارک سے منجلی پایا۔ اس صبح کی روشنی میں میرے دل کا سمندر موجزن ہوا، اور میں نے یہ غزل کہہ ڈالی:۔

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند

وندران ظلمتِ شب آب حیاتم دادند

مکاشفہ حافظ کے بارے میں شیرازیوں کا عقیدہ ہے کہ یہ باباکوہی کے آستانہ پر ظاہر نہیں ہوا تھا، بلکہ چاہ مرتاض علی کے نزدیک ہوا تھا، چاہ مرتاض علی کی وضاحت گزشتہ اوراق میں ہو چکی ہے۔

شیرازیوں کا کہنا ہے کہ جب حافظ نے شاخ نبات نام کی محبوبہ کے عشق سے ہٹ کر عشقِ حقیقی کی طرف رجوع کیا تو صبحدم اس پر ذوق و وجد کی حالت طاری ہوئی اور عالم مکاشفہ میں اس نے اولیاء میں سے کسی ایک کا دیدار کیا جنھوں نے اسے شرابِ روحانی پلائی اور اس کی زبان پر غیب سے یہ غزل آئی ؎

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند

وندران ظلمت شب آبِ حیاتم دادند

اس ضمنی تفصیل کے بعد ہم زیر بحث اصل موضوع کی طرف رجوع کریں گے یعنی:

"ایدل غلام شاہ جہان ......" قبل اس کے کہ قارئین اس بحث کی متفرقات سے محظوظ ہوں، بہتر ہے کہ پوری غزل کو ان کی سہولت کے لیے نقل کیا جائے، خاص کر جب کہ دیوان حافظ کے عام نسخوں میں یہ غزل درج نہیں:۔

ایدل غلام شاہ جہان باش و شاہ باش
پیوستہ در حمایت لطف اللہ باش

از خارجی ہزار بہ یک جو نمی خرند
گو کوہ تا بجوہ منافق سپاہ باش

چون احمدم شفیع بود روز رستخیز
گو این تن بلاکش من پر گناہ باش

آنرا کہ دوستی علی نیست کافر است
گو زاہدِ زمانہ و گو شیخ راہ باش

سل میں جو شگاف پڑے ہوئے ہیں، سب اسی نا اصل سید زادہ کے کرتوت کی یادگار ہیں۔

اُن ہی دنوں حافظ کے کچھ روشن فکر شیدائی تربت کی زیارت کے لیے حافظیہ گئے۔ انھوں نے ریاکار سیّد کے اس ناپسندیدہ فعل سے متنفر ہو کر حافظ کی روح سے پوزش اور انفعال کے طور پر دیوان حافظ سے فال دیکھی تو یہ غزل نکلی:

دلی کہ غیب نمایست جام جم دارد — زخاتمی کہ از وگم شود چہ غم دارد

بخط و خال گدایان مدہ خزینۂ دل — بدست شاہ وشی دہ کہ محترم دارد

بہر حال مقبرہ خستہ حالت میں پڑا رہا اور ۱۳۱۹ ہجری میں فارس کے حاکم منصور میرزا شجاع السلطنہ نے مظفر الدین شاہ قاچار کے حکم سے اُس وقت کے دو ہزار تومان کے خرچہ سے آرام گاہ حافظ کی مرمت کروائی اور اس کے اطراف میں لوہے کی سلاخیں ڈھلوائی گئیں۔ یہ کام فنِ معماری کے اُستاد علی اکبر زین الدولہ (نقاش باشی) کی نگرانی اور سرپرستی میں انجام دیا گیا۔

مرحوم فرج اللہ بہرامی (دبیر اعظم) ۱۳۱۱ ہجری شمسی میں فارس کا گورنر ہوا۔ یہ دانشمند اور روشن دل انسان حافظ کے ساتھ بڑی محبت اور عقیدت رکھتا تھا۔ اُس نے بھی آرام گاہ حافظ کے باغ اور اس کے اردگرد دیواریں مناسب مرمت کرانے کے بعد آرام گاہ کو نئی صورت دی۔

لیکن آرام گاہ حافظ میں اس وقت تک بنوائی گئی تعمیرات اور ان کی مرمت وغیرہ اس شیریں زبان اور دنیائے شعر کے بادشاہ کے شایانِ شان نہ تھیں۔ اتنے عظیم اور لافانی شاعر کے لیے ایک ایسی شاعرانہ اور شاندار عمارت کی ضرورت تھی جو حقیقت میں رندانِ جہاں کے لیے زیارتگاہ بنتی۔ بہر حال خاندان پہلوی کے سب سے پہلے حکمران اور جدید ایران کے بانی رضا شاہ پہلوی نے اس کام کی طرف اپنی توجہ مبذول کی جس کے نتیجے میں موجودہ پُرشکوہ اور مجلل عمارت اور باغ کی تعمیر انجام پائی۔ اس نیک کام میں استاد علی اصغر حکمت کا بڑا ہاتھ رہا جنھوں نے اپنی کتاب "از سعدی تا جامی" میں اس ضمن میں بڑی دلچسپ اطلاع دی ہے جس کو یہاں نقل کرنا لطف سے خالی نہ ہوگا۔

"......اس کتاب کی نگارش کے وقت آرام گاہ حافظ ایک عظیم اور خوبصورت عمارت

چشمۂ عشق اور چار تکبیر تصوف کی اصطلاحیں ہیں۔ چار تکبیر فنا کے چار مقام ہیں
یعنی فنائے آثاری۔ فنائے افعالی فنائے ذاتی اور فنائے صفاتی۔
بہر صورت یہ چند اشارے حافظ کے سنگ مزار پر کندہ کی گئی پہلی غزل سے متعلق تھے،
اور جہاں تک دوسری غزل یعنی "مژدۂ وصل تو کو کز سر جان برخیزم" کا تعلق ہے، استاد
حکمت نے "از سعدی تا جامی" میں لکھا ہے کہ اس غزل کے چند اشعار سنگ مزار پر منقش ہیں۔
راقم الحروف کو ۱۹۶۲ میلادی میں آرام گاہ حافظ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا اور اس وقت
بھی اس غزل کے چند اشعار سنگ مزار پر کندہ کیے گئے نظر آئے۔

کریم خاں زند کے بعد ۱۲۹۵ ہجری میں ۔ ۔ ۔ ۔ معتمد الدولہ فرہاد میرزا فارس کا فرمانروا
مقرر ہوا تو اُس کے حکم سے حافظ کی تربت پر لوہے کی سلاخیں لگائی گئیں، اور مختصر سی مرمت بھی
عمل میں آئی۔ ۱۳۱۸ ہجری میں تہران میں یزد کے ایک شخص ملا شاہ جہاں یزدی نے دیوان
حافظ سے فال نکالی تو یہ شعر نکلا:

ای صبا با ساکنان شہر یزد از ما بگوی   کای سر حق ناشناسان گوی میدان شما

اس سے متاثر ہو کر ملا شاہ جہان نے قبر پر ایک بلند بقعہ اور بارگاہ بنانے کا بیڑا اُٹھایا لیکن
ایک ظاہر پرست سید نے اعتراض کیا کہ ایک زردشتی کیوں کر حافظ کی تربت پر بقعہ بنوائے۔
وہ بے ادب اور اوباش لوگوں کی ایک جماعت لے کر حافظیہ پر آیا، اور ملا شاہ جہاں کی بنائی
ہوئی عمارت کو ڈھایا اور زردشتی کو اس کام کے انجام دینے سے منع کیا۔

اس ناپسندیدہ عمل کے بعد اس سید زادے نے مزید حماقت کا ثبوت دیتے ہوئے قبر
پر دو چار لاٹھیاں ماریں اور کہا:

"اے درویش کچھ لوگ چاہتے تھے کہ تمھیں نجس کریں، میں نے اُنھیں ایسا
کرنے کی اجازت نہیں دی۔"

سنگ مرمر کو باندھنے والی لکڑی میں اب بھی شکستگی کے جو آثار دکھائی دیتے ہیں، اور پتھر کی

گرمے فروش حاجت رندان رواکند ایزد گنہ بخشد و دفع بلا کند ،،

ایک بار اہلِ دانش کی ایک جماعت بارگاہ خواجہ کی عمارت کی تعمیر کے لیے روپیہ جمع کرنے کی غرض سے اکٹھی ہوئی دورانِ گفتگو متذکرہ بالا ابو الفضول کی بات بھی چلی۔ سب لوگوں نے اس نادان کی کم عقلی اور جہالت پر افسوس کا اظہار کیا جس کی بنا پر وہ شخص اُن بزرگوں کی اہانت کرتا تھا جو قوم کے لیے باعث فخر و مباہات ہیں۔ اس کے بعد حافظ کی آرام گاہ پر ایک طرز کی عمارت پر بات چھڑ گئی۔ بہت بحث و مباحثہ ہوا لیکن کوئی مثبت نتیجہ نہ نکلا سب مایوس ہو کر اپنے اپنے گھروں کو چلے۔ اس لحاظ سے کہ تعلیمی خدمات میرے فرائض منصبی میں شامل تھیں اور خواجہ شیراز سے زیادہ ارادت رکھتا تھا، میں باقی لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ دلگیر اور ملول تھا جا کر اپنی کوٹھڑی کے کونے میں غمگین پڑا رہا۔ ہنگام نصف شب کو مجھے سوجھی کہ حافظ کے دیوان سے فال نکالوں اور اس بزرگ کی روح پر فتوح سے استمداد حاصل کروں۔ میں نے اپنے دل میں نیت کی کہ آیا ممکن ہے کہ اس مقبرہ پر مجلل اور پُر شکوہ قبہ میرے جیسے ناتوان شخص کے ہاتھوں بن سکتا ہے؟ جب میں نے دیوان کھولا تو عجیب اتفاق سے وہی بیت پھر نکل آیا جو رات مجلس میں زیر بحث تھا یعنی:

گرمیفروش حاجت رندان رواکند ایزد گنہ بخشد و دفع بلاکند

میں نے لسان الغیب کی روح پر فاتحہ بھیجی۔ خلوص سے سرشار ہو کر یہ یقین کامل ہوا کہ اس مرد روشن دل کی ہمت سے میرا مقصد جلدی پورا ہوگا۔ بہت زیادہ وقت نہ گزرا کہ نیک ذرایع سے کافی روپیہ اکٹھا ہوا، اور ۱۳۱۴ ہجری شمسی میں جب کہ میں ابھی وزارت تعلیم کا سربراہ تھا آرام گاہ پر ایک اونچا اور شاندار گنبد بننے لگے۔ خواجہ لسان الغیب کی قدسی روح اور اُس کے باطنی فیض کے نور سے یہ عمارت ۱۳۱۶ ہجری شمسی میں پایۂ تکمیل کو پہنچی اور اس کے لیے سرکاری خزانہ سے حتیٰ کہ ایک دینار تک کی منت نہ اُٹھانی پڑی۔ آرام گاہ پر نئی عمارت کی تعمیر کی نگرانی اس وقت صوبۂ فارس کے محکمہ تعلیم میں عمارات اور کارپردازی کے منصدی علی سامی کے ذمہ تھی۔ اس شخص نے اس عمارت

پر مشتمل ہے، جن دنوں میں (حکمت) ایران کی وزارت تعلیم میں مشغول خدمات تھا یہ عمارت انہی دنوں بحمد اللہ انجام پائی۔

۱۳۱۰ ہجری شمسی میں شیراز کے کچھ خیر اندیش حکام نے حافظیہ کی قدیم عمارت جو کریم خان زند کے زمانہ سے باقی تھی اور جس میں خستگی اور بوسیدگی کے آثار نمایاں تھے، کی مرمت کا فیصلہ کیا۔ پرانی عمارت پتھر کے چار ستونوں پر کھڑے دو رویہ ایوانوں پر مشتمل تھی اور ان ستونوں کے درمیان پتھر کی دیوار کھڑی تھی اس کو گرایا گیا اور اس جگہ نئی عمارت کی تعمیر کا منصوبہ تیار کیا گیا لیکن افسوس کہ حوادث روزگار نے حافظ کے ان عقیدتمندوں کو نئی عمارت پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی فرصت نہ دی۔

۱۳۱۳ ہجری شمسی میں فردوسی کی موزوں اور پرشکوہ آرام گاہ بنانے کے سلسلہ میں ایران کے لوگوں میں اپنے بزرگانِ ادب کے آثار باقیہ کی از سرِ نو تعمیر اور ان کی بقا کے بارے میں جوش و خروش پیدا ہوا اور سب لوگ اس طرف متوجہ ہوئے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے مناسب اور فوری قدم اٹھائے جائیں۔

شیراز کے صاحبِ دل لوگ آرامگاہ حافظ کی خرابی سے محزون اور آزردہ خاطر تھے۔ میں بھی اس تاثر اور تاسف میں اپنے ہمشہریوں کا شریک تھا۔ میں ہمیشہ دل ہی دل میں سوچا کرتا کہ کس قدر لازمی ہے کہ ایک ایسی عمارت خواجہ حافظ کے مزار پر بطور یادگار بنائی جائے جو اس بلند پایہ شاعر کے مقام کے مناسب ہو تاکہ اس طرح میں اس بزرگ کی نسبت ———— اپنی فرض شناسی کی ایک ادنیٰ علامت باقی چھوڑوں۔ انہی دنوں ایک بوالفضول نے تہران میں چھپنے والے کسی رسالہ میں لسان الغیب خواجہ حافظ صاحب کے عالی مقام کی نسبت بے سبب گستاخی کی اور اس پُر زور غزل کو اس کی خطا کاری کا ثبوت ٹھہرایا۔

کی ساخت کے ہیں یہاں کے دونوں طرف کی دیواریں سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہیں جن کے بالائی حصوں
میں سنگ مرمر کے کتبے لگے ہوئے ہیں۔ ان پر حافظ کی مشہور غزلیں امیر الکتاب کردستانی امید جو اپنے وقت
کے مشہور و معروف ثلث نویسوں میں پہلا عدم کہتا تھا، کے خط ثلث کے عکس سے کندہ کروائی گئی ہیں
ان کی ترتیب اس طرح ہے دیوان کے مشرقی حصہ میں پیشانی والے کتبہ پر یہ غزل ہے:

روضۂ خلد برین خلوت درویشان است　　　مایۂ محتشمی خدمت درویشان است

غزل کا مندرجہ ذیل شعر غربی پیشانی والے کتبہ پر کندہ ہوا ہے:

ای توانگر مفروش این نخوت که ترا　　　سیم و زر در کنف همت درویشان است

چونکہ اس غزل کا ذکر آیا ہے مناسب ہے کہ ہم اس ضمن میں کچھ فروعی اطلاعات اپنے قارئین
کی خدمت میں پیش کریں۔

شجاع السلطنت کے زمانے میں عبد الصمد معروف بہ اللہ ہاشمی ایک باذوق اور ہنرمند
آدمی تھا، اس نے اس غزل کو امیر الکتاب کے خط سے اٹھا کر کاغذ کے ایک سیاہ تختہ پر چھاپ
کیا تھا اور سنگ مرمر کے متذکرہ بالا کتبے اسی خط سے استنساخ ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر قاسم غنی کے
دیوان حافظ میں اس غزل کے آخر میں ایک اور شعر دیکھنے میں آیا جو یوں ہے:

من غلام نظر آصف عهدم کو را　　　صورت خواجگی و سیرت درویشان است

آصف عہد سے مراد حافظ کا ممدوح خواجہ جلال الدین توران شاہ ہے، جس کے متعلق ذکر
اگلے باب میں آئے گا۔ شاید مامورین نے کسی مصلحت کے تحت یہ شعر کتبہ ہی نہ کروایا ہو
۸۲۷ ہجری شمسی میں تاج الدین احمد وزیر کے حکم سے شیراز میں فضلا کی ایک جماعت کے
ذریعہ ایک مجموعہ تیار کروایا گیا تھا جس میں انھوں نے اپنے خط میں شاعروں کا نمونۂ
کلام درج کیا تھا۔ شرکت کرنے والوں میں ایک شخص بنام مظفر الدین ملک السلیمانی نے حافظ
کی یہ غزل لکھی جس میں "آصف عہدم" والا شعر شامل ہے۔ البتہ اس نے غزل کا مقطع
یوں لکھا تھا:

کے متعلق جو کچھ اپنی کتاب "شیراز" میں لکھا ہے، اُسے مختصر طور پر یہاں نقل کیا جاتا ہے:۔

"اس عمارت کا خاکہ ایک فرانسیسی علم باستان شناسی کے صلاح کار مسٹر آندرہ گداد (ANDRE GODDARD) نے تیار کیا تھا لیکن اسکی بناوٹ میں بنیادی طرز کریم خاں زند کے وقت کی ہی رکھی گئی تھی، اور صرف موزوں تعمیر یا ترمیم عمل میں لائی گئی تھی۔ اصل تعمیر رضا شاہ پہلوی کی حکومت کے ۱۵ ویں سال میں شروع ہو کر، ویں سال میں مکمل ہوئی تھی۔ داخلہ اور آرامگاہ کے باغ کا کُل رقبہ دو ہزار مربع میٹر ہے آرامگاہ کے دو حصے ہیں، ورودی اور غرب شرقی، ان کے درمیان داخل ہونے کے لیے ۱۲ میٹر عرض کا ایک کشادہ راستہ ہے جس کے دونوں طرف باغیچے لگے ہوئے ہیں۔ ہر باغیچے کے وسط میں مستطیل شکل کا ایک حوض بنا ہوا ہے جس کے پتھر یک پارچہ سل کے بنے ہیں۔ حافظیہ سے شیراز کا خوبصورت منظر دیکھا جا سکتا ہے۔ باغ کی دوسری طرف جہاں آرام گاہ ہے، داخل ہونے کی جانب سے قدرے اونچی جگہ ہے۔ اور اس کی تینوں طرف یعنی شمال مشرق اور مغرب میں سادہ عمارتیں بنائی گئی ہیں۔ جو تقریباً نامتناسب سی ہیں۔ اس کے آس پاس کچھ نامور لوگوں کی قبریں بھی ہیں، حافظ کی قبر وسط میں سطح زمین سے تقریباً ایک میٹر کی بلندی پر ہے۔ پتھر کے پانچ پایہ مزار کے ارد گرد مدوّر شکل میں بنائے گئے ہیں۔ مقبرہ کی چھت پتھر کے آٹھ ستونوں پر کھڑی ہے اور اس کا اندرونی حصہ رنگین اینٹوں اور ٹائلوں کا بنا ہوا ہے۔ مقبرہ کے گنبد کی بیرونی شکل درویشوں اور قلندروں کی ٹوپی جیسی ہے۔ چھت پر الیومینیم کی چادریں بچھی ہوئی ہوئی ہیں تاکہ وقت گزرنے کے ساتھ ان کا رنگ زنگاری اور ٹائلوں جیسا ہو جائے۔ آرام گاہ کی چھت کے اندرونی حصہ میں ستونوں کے یک پارچہ پتھر کی سلوں پر حافظ کی یہ غزل نہایت عمدہ خط میں کندہ کروائی گئی ہے۔"

حجاب چہرہ جاں میشود غبار تنم   خود شادمی کہ ازیں چہرہ پردہ برفگنم

جن دو باغیچوں کا ذکر کیا گیا۔ ان میں ایک وسیع اور مجلل ہال ایک دوسرے کے ساتھ جوڑتا ہے۔ اس ہال کا طول ۵۶ میٹر اور عرض سات میٹر ہے۔ اس میں پتھر کے بڑے بڑے ستون ہیں۔ وسط کے چار ستون یک پارچہ اور کریم خاں زند سے متعلق ہیں۔ باقی دو پارچہ پتھر کے جدید بنائے

پایسی

اور پاپیٹی لوشہ پر:

چراغ اہلِ معنی خواجہ حافظ | کہ شمعی بود از نور تجلی
چو در خاک مصلی یافت منزل | بجو تاریخش از خاک مصلی

حافظ کی تربت کے قرب میں کئی شخصوں کو دفن کئے جانے کا فخر حاصل ہو چکا ہے۔ ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو علمی اور ادبی لحاظ سے زیادہ مشہور نہیں تھے، مگر ان سے قطع نظر کچھ ایسی نامور ہستیاں بھی ہیں جو علم و ادب کی دنیا میں بڑی قدر و منزلت رکھتے ہیں۔ نویں صدی ہجری کا ایک شاعر مولانا اہلی شیرازی بھی یہیں دفن ہے۔ اس کے سنگ مزار پر اس کی اپنی ہی کندہ کی گئی یہ رباعی ہے:۔

دوش از غم عمر رفتہ در منزل خویش | در فکر فرو شدم ولی با دل ریش
از حاصل عمر دو کفم ہیچ نبود | شرمندہ شدم ز عمر بی حاصل خویش

ایک اور دانشمند اور تاریخ داں فرحت اللہ شیرازی متوفی ۱۳۰۰ ہجری شمسی (سخنوران فارس) کو بھی تربت حافظ کی قربت نصیب ہوئی۔

اب ایران میں دفن اموات کے وزارت خانہ کے حکم کے تحت آرام گاہ حافظ کے احاطہ میں کسی بھی اسم و رسم کے انسان کو دفن کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

▲

حافظ آنجا بر ادب باش کہ سلطانی وملک
همہ از بندگی حضرت درویشان ماست

ہال کے باہر کی طرف پیشانی پر جس کا رُخ داخلہ کے باغ کی طرف ہے، لاجوردرنگ کی اینٹوں سے معرق، درج ذیل مطلع کی غزل کندہ ہے:

گلعذاری ز گلستان جہان ما را بس　　زین چمن سایۂ آن سرو روان ما را بس

اس کے بعد عمارت کی تاریخ تکمیل (۱۳۱۶ ہجری شمسی) کندہ ہوئی ہے۔ اصل عبارت یوں ہے:

"ساختمان آرام گاہ خواجہ شمس الدین محمد شیرازی بحسب امر اعلیٰ حضرت همایون شاهنشاہ ایران رضا شاہ پہلوی بدستور جناب حکمت وزیر معارف و اوقاف و صنائع مستظرفہ در سنۂ یک ہزار و سی صد و شانزدہ ہجری شمسی انجام پذیرفت"

ہال کے باہر مقبرہ کی طرف والی پیشانی پر لاجوردی زمین پر خط ثلث میں ٹائلوں پر یہ غزل درج ہے:

چو بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطاست　　سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست

مقبرہ کے ارد گرد ٹائلوں میں خط ثلث میں اور کئی غزلیں ثبت ہو چکی ہیں۔ جن کی تفصیل یوں ہے۔ شمالی دیوار کے کتبہ پر:

سحرم ہاتف میخانہ بدولت خواہی　　گفت باز آ کہ دیرینۂ این درگاہی

مقبرہ کا احاطہ کرنے والے مغربی ضلع کے کتبہ پر:

بیا کہ قصر امل سخت سست بنیاد است　　بیار بادہ کہ بنیاد عمر بر باد است

اسی محوطہ کی مشرقی دیوار کے کتبہ:

مزرع سبز فلک دیدم و داس مہ نو　　یادم از کشتۂ خویش آمد و ہنگام درو

سنگ مزار کے بالائی گوشہ پر یہ بیت کندہ ہوا ہے:

بر سر تربت ما چون گذری ہمت خواہ　　کہ زیارتگہ رندان جہان خواہد بود

دوسرا باب

حافظ کے حالاتِ زندگی کے ماخذ

حافظ کا مختصر یا مفصل ذکر کرنے والے تین دستوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔

(۱) اوّل وہ معاصرین یا اُس کے زمانے کے بہت قریب کے شاعر، مورخ اور راوی وغیرہ جنھوں نے اپنی نگارشات میں مختلف مطالب کے دوران ضمنی طور پر اُس کا ذکر کیا ہے۔

(۲) دوسرے وہ تذکرہ نویس جنھوں نے یا تو اپنی کاوش سے یا ایک دوسرے سے منقول حالات، حکایات، اور روایات کو دیگر شاعروں کے بارے میں لاکر حافظ پہ بھی کچھ اطلاع ہم تک پہنچائی ہے۔

(۳) تیسرے دورِ حاضر میں ایران کے محقق، ناقد، اور مبصر جنھوں نے حافظ کے احوال اور اس کی شاعری پر اپنی دانست کے مطابق روشنی ڈالی ہے۔

پہلی جماعت کے لوگوں نے عام طور پر کسی واقعہ کی مناسبت سے حافظ کا شعر یاد دلایا ہے اور اُس کے ساتھ کوئی ملحق حکایت یا روایت بیان کی ہے۔ ہم سب سے پہلے دستہ اول کے ماخذ پر روشنی ڈالیں گے۔

گروہ اول

منظفر الدین ملک السلیمانی کے نام کے ایک شخص نے مندرجہ ذیل غزل اور قطعہ کو

ترتیب سے اس مجموعہ میں درج کیا ہے:۔

غزل :۔ روضۂ خلد بریں خلوت درویشان است　　　　مایۂ محتشمی خدمت درویشان است

قطعہ:۔ بسمع خواجہ رسان ای ندیم وقت شناس

سخاوتی کہ در آن اجنبی صبا باشد

(۳) مواہب الہی۔ اس کا مؤلف معین الدین یزدی۔ امیر مبارز الدین اور اس کے بیٹے

شاہ شجاع کا ہمعصر تھا اور علم حدیث میں بڑی دسترس رکھتا تھا۔ ۷۶۷ھ ہجری میں انہوں نے

مواہب الہی نام کی تاریخ لکھی جس میں حافظ کے یہ دو شعر بطور سند پیش کئے لیکن استشہاد

کی وجہ نہیں بتائی۔

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت فلندری داند

نہ ہر کہ آئینہ ساز د سکندری داند

نہ ہر کہ طرف کلہ کج نہاد و تند نشست

کلاہ داری و آئین سروری داند

(۴) دیوان روح عطار۔ روح عطار حافظ کے ہمعصر شاعروں میں سے تھا جس نے

واضع طور پر حافظ کا نام لیا ہے۔ دیوان روح عطار کے ایک نسخہ کی کتابت ۸۵۵ھ

میں ہوئی تھی اور وہ کتابخانہ شورا ملی تہران میں محفوظ ہے۔ اس میں خواجہ قوام الدین محمد

صاحب عیار کی مدح میں ایک قصیدہ ہے۔ روح عطار نے حافظ کے ہمعصر شاعر سلمان

ساوجی اور حافظ کے اشعار کا موازنہ کرتے ہوئے ایک قطعہ لکھا ہے جو اس کے دیوان

میں موجود ہے۔ روح عطار اور متذکرہ بالا قطعہ کے بارے میں استاد حکمت نے یہ

عبارت لکھی ہے:۔

"۔۔۔۔ کتاب خانہ شوری ملی میں شمارہ ۱۱۸۳ ایک دیوان کا قلمی نسخہ ہے

(۱) المعجم فی معاییر اشعار العجم تالیف ۷۸۱ ہجری۔ محمد بن قیس رازی کی مشہور کتاب المعجم کے موجودہ نسخہ کی کتابت ابن فقیہہ نام کے ایک شخص نے ۷۸۱ ہجری میں بغداد میں کی تھی اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ نسخہ کی کتابت حافظ کی وفات سے صرف گیارہ سال پہلے انجام پائی تھی۔ تشبیب غزل کے باب میں، مؤلف نے عمادی کے اشعار کے شواہد کی جگہ حافظ کی غزل کو پیش کیا ہے۔ حافظ کے علاوہ اُس نے سید جلال الدین عضد، اور سلمان ساوجی کی غزلیں بھی بطور سند لائی ہیں۔ حافظ کی مذکرہ غزل یہ ہے:

عکس روی تو چو در آئینۂ جام افتاد   عارف از خندۂ می در طمع خام افتاد

لیکن ہاشم رضی کے چھپے ہوئے دیوان میں یہ شعر یوں دیکھا گیا ہے:

عکس روی تو چو در آئینۂ جام افتاد   عاشق سوختہ دل در طمع خام افتاد

گمان ہوتا ہے کہ حافظ نے سلمان ساوجی کی غزل سے اقتدا کی ہو، جو یوں ہے:

از ازل عکس می لعل تو در جام افتاد   عاشق سوختہ دل در طمع خام افتاد

المعجم کا زیر نظر نسخہ اس وقت کتاب خانہ محمد علی فروغی سے متعلق ہے۔

(۲) مجموعہ تاج الدین احمد وزیر شاہ شجاع، تالیف ۷۸۲ ہجری۔ یہ مجموعہ حافظ کی وفات سے قبل تاج الدین احمد کے حکم سے مرتب کیا گیا تھا۔ اس میں اُس وقت کے کئی فاضلوں نے اپنے اپنے خط میں چند صفحے لکھے تھے، اس میں چار بار حافظ کے اشعار کو نقل کیا گیا ہے۔ شرکت کرنے والوں میں شہاب الدین المرحوم شمس محمد شہاب ہے جس نے بزرگوں کے اشعار نقل کرتے ہوئے حافظ کی درج ذیل مطلع کی غزل کو نقل کیا ہے۔

خدا کہ صورت ابروی دلگشای تو بست   کشاد کار من و کرشمہ ہای تو بست

دوسرا شخص جس نے حافظ کی مندرجہ ذیل مطلع کی غزل درج کی ہے، احمد بن محمد الحسینی ہے:

بر تو خوانم ز دفتر اخلاق
آیتی در وفا و در بخشش

نمودہ اند چنیں مالکان ملک سخن　　　　که کردہ اند مسخر جہان زتیغ بیان

باین کمیتہ کہ از پیر فکر خویش بپرسس　　　　که نطق حافظ بہ یا فصاحت سلمان

چو کردم این سخن از عقل استفسا　　　　کہ ای خلاصۂ ادوار و زبدۂ ارکان

بگو کہ شعر کدامین ازین دو نیکو تر　　　　کہ بردہ اند کنون شہرت از میدان

جواب داد کہ سلمان بدہر ممتاز است　　　　بلفظ دلکش معنی بکر و شعر روان

دگر طراوت الفاظ جزیل حافظ بین　　　　کہ شد بلاغت او رشک چشمۂ حیوان

یکی بگاہ بیان طوطی است شکر بار　　　　یکی بنظم روان بلبلیست خوش الحان

زبرج حافظ این ماہ نظم رخشندہ　　　　ز درج فکرت آن لؤلؤ سخن ریزان

درین محاسن اخلاق چون عبیر بار　　　　دران فنون فضائل چو دانۂ در رمان

یکی بگلشن نظم است سوسن آزاد　　　　یکی بباغ لطائف چو لالۂ نعمان

یکی موافق طبع لطیف همچون عقل　　　　یکی مناسب جسم شریف همچو جان

هزار روح فدای دم چو عیسی این
هزار جان گرامی نثار گفتۂ آن

(۵) دیوان کمال خجندی :- کمال خجندی حافظ کا ہمعصر شاعر تھا اور اس کی وفات کے گیارہ سال بعد ۸۰۳ھ میں فوت ہوا۔ اگرچہ تاریخ نویسوں کے درمیان اس کے سال انتقال پر کافی اختلاف رہا ہے۔ کمال نے بارہا حافظ کی غزلوں سے اقتدا کیا ہے اور صریحاً حافظ کا نام لیا ہے، مثلاً :

حافظ :- ستارہ ای بدرخشید و ماہ مجلس شد　　　　دل رمیدہ ما را انیس و مونس شد

کمال : شبی کہ روی تو مرا چراغ مجلس شد　　　　بسوختن دل پروانہ اش ہوس شد

نشد بطرز غزل ہمعنان ما حافظ!
اگر چہ در وصف رندان ابوالفوارس شد

جو جلال الدین عضد سے منسوب ہوا ہے اس کی کتابت ۸۳۸ھ میں ہوئی ہے"۔

اس کے بعد ایک اور دیوان ہے جس پر کوئی تاریخ درج نہیں، لیکن اسی شخص کے خط میں ہے۔ جو اول الذکر دیوان رشتۂ تحریر میں لایا ہے۔ اس کا نام "دیوان روح عطا" ہے اور اس بیت سے شروع ہوتا ہے:۔

الٰہی پرتو از نور اسرار تجلی کن بجان روح عطار

روح عطار شیراز کا شاعر اور لرستان کے اتابکوں میں سے اتابک فراسیاب کا مدح گو تھا۔ شاہ شجاع مظفری کا ہمعصر ہونے کے علاوہ اس نے خواجہ قوام الدین محمد بن علی عیار کی مدح میں ایک قصیدہ بھی لکھا ہے۔ روح عطار کی جو غزلیں ہم تک پہنچی ہیں اُن میں فان اور پند و نصائح جیسے موضوعات ملتے ہیں۔ اُس نے کبھی روح اور کبھی روحی تخلص کیا ہے۔ اس قلمی نسخہ میں ایک قطعہ بھی درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کو چند باذوق دوستوں نے سلمان اور حافظ کے درمیان موازنہ کرنے کو کہا تھا اور اُس نے دونوں کو مساوی کر کے اپنی علمی دیانت داری کا ثبوت دے کر اپنے کو ایک مشکل سے آزاد کیا۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ آٹھویں صدی ہجری کے آواخر میں ان دونوں استادوں کی شہرت اور ان کا کمال اپنی بلندی کو پہنچ چکا تھا۔ سوال اور جواب کے دونوں قطعے قارئین کی نظر سے گزارے جانے کے قابل ہیں:۔

ملوک مملکت نظم و ناقدان سخن کہ باد خاطر ایشان ایمن از حدث زمان
اہل طبع گروہی مخالفت دارند بی تراجح اشعار حافظ و سلمان
گروہی از فضلا متفق کہ این بہتر جماعتی دگر انکار میکنند کہ آن

منوک خامہ گہر نثار سحر نمای
بیان کنید گزین دو کرا بود رجحان

روح عطار نے جواب میں یہ منظومہ لکھا تھا:۔

ڈاکٹر قاسم غنی کی تالیف "عصر حافظ"، جلد اول ملاحظہ ہو۔

(۸) تاریخ جغرافیائی (۸۲۰ھ) حافظ ابرو کی یہ تالیف کئی واقعات کی اطلاع کے لحاظ سے بڑی اہم ہے اس کتاب کے تیسرے باب میں ہم اس پر خاطر خواہ روشنی ڈالیں گے۔ دو جلدوں پر مشتمل اس کتاب کو اس نے تیمور کے بیٹے شاہرخ کے حکم سے لکھا تھا۔ شاہ شجاع کی موت کا ذکر کرتے ہوئے یہ عبارت درج ہوئی ہے:

"ولادت شاہ شجاع در بیست و دوم جمادی الآخر سنہ ثلث و ثلثین و سبع مائہ.... وفات او در بیست دوم شعبان پنجاہ و سہ سال و دو ماہ عمر یافت۔ مولانا شمس الدین حافظ شیرازی در تاریخ وفات شاہ شجاع گفتہ است:

دیدآن چنان کز و عمل الخیر لا یفوت | رحمان لا یموت چون آن پادشاہ را
تاریخ سال واقعہ رحمان لا یموت | مونش قرین رحمت خود کرد تا بود

(۹) دیوان غزلیات شاہ شجاع (۸۲۳ھ) شاہ شجاع علم دوست تھا اور حافظ کا ممدوح۔ فارسی کے علاوہ عربی پر بھی دسترس رکھتا تھا۔ اس کی فارسی غزلیات کو سعد الدین انسی نے ایک دیوان میں جمع کیا تھا اور بین البحرین کے ایک شخص عبدالحی نے اپنے خط میں اس کی کتابت کی تھی۔ اس دیوان کے عنوان میں یہ عبارت درج ہے:

".... افتتاح دیوان السلطان الاعظم ابی الفوارس شاہ شجاع تغمدہ اللہ برحمتہ"

عبدالحی نے اس عنوان کے مقابل میں متن کے ہی خط میں اس عبارت کا اضافہ کیا ہے۔

".... این شاہ شجاع ممدوح خواجہ حافظ شیرازی است علیہما الرحمتہ"

عبدالحی نے اس مجموعہ کو ۸۲۳ ہجری میں یعنی خواجہ حافظ کی وفات کے اکیس سال بعد لکھا تھا۔ اس سے ایک دلچسپ بات کا پتہ چلتا ہے کہ خواجہ حافظ کی وفات کے صرف

کمال کی ایک اور غزل کے تین شعر ملاحظہ ہوں۔

مرا ھست اکثر غزل ہفت بیت ۔۔۔ چو گفتار سلمان نرفته ز یاد

که حافظ همی خواند اندر عراق ۔۔۔ بلند و روانش چو مبنع شداد

به بنیاد هر هفت چون آسمان ۔۔۔ کزین جنس بیتی ندارد عماد

حافظ سے کمال کی اقتدا یا اس کے برعکس صورت حال کی بیشتر جانکاری، شعر العجم، تاریخ ادبیات ایران پروفیسر براؤن اور "از سعدی تا جامی" میں مل سکتی ہے۔ استاد علی اصغر حکمت نے کہیں بھی صریحاً یہ نہیں کہا ہے کہ مندرجہ بالا قطعے میں حافظ شیرازی کی طرف اشارہ ہے۔

(۶) ظفر نامہ ۸۰۲ھ: نظام الدین شامی نے امیر تیمور کے حکم سے ۸۰۴ھ میں یعنی حافظ کی وفات کے بارہ سال بعد ظفر نامہ لکھنا شروع کیا اور اپنے سال وفات یعنی ۸۰۸ھ تک کے حوادث کو بیان کرتا رہا۔

اس کتاب میں مؤلف نے صرف ایک جگہ حافظ کا شعر نقل کیا ہے۔ جب تیمور نے نے شیراز سے مراجعت کی اور عراق کا رخ کیا تو اس ضمن میں شامی نے یہ عبارت لکھی ہے:

"امیر صاحبقراں در اوج کامگاری و اقتدار به عیش و طرب مشغول شد و سوای ملک خانم و تومان آغا طرب ہائے پادشاھانہ کردند و آوازھای به آوازهای خوش الحان دلپذیر مدهوش بوده در مقام نوشانوش به عشرت و کامرانی گذرانیدند از سر فارغ بال به زبان حال میگفتند!

یک دو روزی که درین مرحله فرصت داری
خوش بیر آسای زمانی خوش آسای زمانی که زمان این همه نیست

(ظفر نامہ، نظام شامی چاپ بیروت صفحہ ۱۳۶)

(۷) دیوان اطعمہ شیرازی (۸۴۰ھ) حسام الدین اطعمہ شیرازی قطعی طور پر حافظ کا ہمعصر تھا اور اس کی بیشمار غزلوں کی پیروی کرتا رہا۔ اس ضمن میں مفصل اطلاع کے لیے

قزوینی نے اس میں حافظ اور امیر تیمور سے متعلق حکایت دیکھی اور اس کو الگ نقل کیا۔

(۱۲) مجمل فصیحی :- اس تاریخ کا مؤلف فصیحی خوافی ۷۷۰ ہجری میں پیدا ہوا تھا۔ حافظ کی وفات کے وقت اس کی عمر پندرہ برس کی تھی۔ فصیحی نے دو بار اپنی تاریخ میں حافظ کا ذکر کیا ہے۔ پہلی بار ۷۹۲ھ کے واقعات درج کرتے ہوئے مندرجہ ذیل عبارت لکھی ہے :-

"وفات مولانا و اصم افتخار الافاضل شمس الملۃ والدین محمد حافظ الشیرازی الشاعر بہ شیراز مدفوناً بہ کت و در تاریخ او گفت اند:

بسال با و صاد و ذال ابجد ز روز ہجرت میمون احمد
بسوی جنت اعلی روان شد فرید عصر شمس الدین محمد

(یادداشت، فصیحی خوافی نے شیخ سعدی کے مدفن کو بھی "کت" ہی لکھا ہے۔)

دوسری بار ۸۰۰ھ کے واقعات درج کرتے ہوئے خواجہ احمد تونسی کا ہرات میں بطور حاکم مقرر ہونے اور لوگوں کے ساتھ برے سلوک کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس وقت سید جابذی تبریز سے آرہا تھا، اس نے خواجہ احمد کے نام ایک خط میں حافظ کا یہ شعر درج کیا۔

چشمت بعشوہ خانہ مردم خراب کرد
مخموریت مباد کہ خوش مست میروی

(۱۳) جامع التواریخ حسینی : (۸۵۵) جامع التواریخ کے مؤلف حسن بن شہاب یزدی نے اپنی کتاب ۸۵۵ھ میں مکمل کی تھی۔ اس میں کئی بار حافظ کے اشعار بطور مثال پیش کئے گئے ہیں۔ بعض اوقات حافظ کا نام لیے بغیر ایسے اشعار درج ہوئے ہیں اور بعض اوقات حافظ کو گوناگوں القاب سے یاد کرکے اس کے اشعار نقل کیے ہیں۔ القاب بالعموم یوں ہیں:
شیخ العارفین۔ افصح الشعراء (نسخہ جامع التواریخ۔ کتابخانہ ملی تہران)

اکتیس برس بعد ایران سے دور بین النہرین کے شمال میں ماردین تک جو عبدالحی کا آبائی وطن تھا، اس کی شہرت پھیل چکی تھی۔ شاہ شجاع کے فارسی دیوان کو استاد سعید نفیسی نے بڑی محنت کے بعد جمع کر کے تہران میں ایک مبسوط اور قابل قدر مقدمہ کے ساتھ چھاپا اور احمد کسروی نے بھی اپنے بعض مقالات میں اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے

(۱۰) ظفرنامہ تیموری:۔ شرف الدین علی یزدی نے اپنی مشہور تاریخ "ظفرنامہ" کو حافظ کی وفات کے صرف چھتیس برس بعد یعنی ۸۲۸ھ میں مکمل کیا تھا، اس میں متعدد مواقع پر حافظ کے اشعار نقل کیے ہیں، اس کی بے شمار تمثیلوں، تمسکوں اور شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ کا دیوان اس کے معاصرین اور قریب العصر اشخاص میں عام طور پڑھا جاتا تھا اور کافی مقبول تھا۔

(۱۱) انیس الناس (۸۳۰) شجاع شیرازی، شیراز کے حکمران بادشاہ شیخ ابو اسحاق اینجو کے چچازادوں میں سے تھا، اس نے ۸۳۰ھ میں "انیس الناس" کے نام سے ایک رسالہ شاہرخ میرزا کے لیے لکھا تھا۔ رسالے کا موضوع عام طور پر حکمت عملی ہے۔ اس میں مولف نے حافظ اور تیمور گورکانی کے درمیان ملاقات اور اس سے متعلق مشہور لطیفہ درج کیا ہے، وہ شعر بھی درج کیا ہے جو اس تاریخی ملاقات سے وابستہ کیا گیا ہے یعنی

اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل مارا
بخال ہندویش بخشم سمرقند و بخارا را

اس داستان کے بارے میں ہم اگلے صفحوں میں کچھ تفصیل درج کریں گے۔ ڈاکٹر قاسم غنی نے تاریخ عصر حافظ" کی پہلی جلد کے صفحہ "۵" کے حاشیہ پر لکھا ہے کہ:

"کوئی شخص" انیس الناس" کا ایک قلمی نسخہ کتاب خانہ ملی تہران میں فروخت کرنے کی غرض سے لایا۔ کتابخانہ کے مأمورین کی طرف سے علامہ قزوینی کو اس پر اپنی رائے دینے کے لیے کہا گیا۔ مطالعہ کرتے وقت علامہ

ہوئے دیوان البسہ کے نام سے ایک دیوان مرتب کیا۔ البسہ نے حافظ کے اشعار کی پیروڈی (PARODY) اسی طرح کی جس طرح اطعمہ نے کی ہے۔ اس ضمن میں ہم مزید تفصیل اگلے باب میں دیں گے۔ لیکن مفصل اطلاع کے لیے "مقدمہ تاریخ عصر حافظ" مرتبہ ڈاکٹر قاسم غنی ملاحظہ ہو۔"

(۶) مطلع السعدین (۸۷۵) عبدالرزاق سمرقندی نے اپنی تاریخ مطلع السعدین میں متعدد موقعوں پر صراحت سے حافظ کا نام لیا ہے، اور مناسب جگہوں میں اُس کے اشعار سے استشہاد کیا ہے۔ ہم یہاں ایسے صرف دو موقعوں کا ذکر کریں گے۔

(۱) امیر مبارزالدین کے شیراز کے مسخر کرنے اور تبلیغ دین کے بارے میں یہ عبارت لکھی ہے:

"امیر مبارزالدین سادات و علما را معزز و مؤقر داشت و در امر معروف و نهی منکر به نوعی سعی نمود که کس را یارا نبود که نام ملاهی و مناهی برد و مولانا شمس الدین محمد شیرازی در آن زمان می فرمایند:-

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گل بیز است
ببانگ چنگ مخور می کہ محتسب تیز است

(۲) سال ۷۸۱ھ کے واقعات اور خوارزم پر چڑھائی اور فوری فتح کا حال لکھتے ہوئے عبدالرزاق سمرقندی نے بیان کیا ہے کہ:

امیر تیمور کے لشکر نے خوارزم کے خزانوں کو لوٹا، عمارات کو ڈھایا اور ظلم و بیداد گری کو عام کیا۔ چنانچہ یہ آباد اور خوش حال شہر آناً فاناً تباہ اور برباد ہو گیا۔ بربادی کی خبر ہر طرف پھیل گئی۔ چنانچہ شیراز کا بلبل داستان سرا یعنی خواجہ حافظ گلشن شیراز میں یوں نغمہ سرا ہوا:

بخوبان دل مده حافظ ببین آن بے وفائیہا کہ با خوارزمیان کردند ترکان سمرقندی

(۱۴) تاریخ جدید یزد: (۸۶۲ھ) یہ احمد بن حسین الکاتب یزدی کی پرمایہ تاریخ ہے جس کی تالیف ۸۶۲ ہجری کے قریب تکمیل کو پہنچی تھی، مؤلف نے تین بار حافظ کے اشعار کو بطور مثال پیش کیا ہے۔ پہلی بار یزد کی قدیم عمارتوں کے کھنڈرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"..... وکلندر را زندان ذوالقرنین خوانده اند۔ چنانچہ مولانائے اعظم، شمس الملۃ، محمد الحافظ شیرازی فرموده است:

بیت

دلم از وحشت زندان سکندر بگرفت — رخت بر بندم و تا ملک سلیمان بردم

تازیان را چو غم حال گرانباران نیست — پارسایان مددی تا خوش و آسان بردم

مقصود آنکه بنای یزد سکندر ساخت و جہت زندان پرداخت"

بعض نسخوں میں دوسرا شعر اس طرح پایا گیا ہے:

نازکان را چو غم حال گرانباران نیست — ساربانان مددی تا خوش و آسان بردم

تازیان یزد دراصل یزد میں واقع ایک محلہ کا نام تھا اور گمان یہ ہے کہ غزل مذکور ان غزلوں میں شامل ہے جو حافظ نے یزد میں اپنے قیام کے دوران کہی تھیں، اور پہلے مصرع میں "نازکان" کی جگہ "تازیان" کا ہونا قرین قیاس ہی نہیں بلکہ اصح تر ہے۔ دیوان حافظ مرتبہ ڈاکٹر قاسم غنی اور مرتبہ ہاشم رضا دونوں میں "تازیان" اور "پارسایان" دیکھے گئے ہیں۔

تاریخ جدید یزد میں دو اور موقعوں پر حافظ کے یہ دو شعر درج ہوئے ہیں:

بیت

سکندر را نمی بخشند آبی[1] — بزور و زر میسر نیست این کار

روز وصل دوستداران یاد باد[2] — یاد باد آن روزگاران یاد باد

۱۵۔ دیوان البسہ: مولانا نظام الدین قاری یزدی نے بسحاق اطعمہ کی تقلید کرتے

البسہ

اہم اور مستند تذکرے

اب تک ہم نے جن ماخذوں کو پیش کیا، وہ پہلی قسم سے تعلق رکھتے ہیں، یعنی ایسے تذکرے، دستاویز، دیوان یا تاریخی نگارشات، جن میں بالواسطہ یا بلاواسطہ حافظ کا ذکر آیا ہے، یا اس کے اشعار کو بطور تمثیل پیش کیا گیا ہے۔ ایسے ماخذ عام طور سے نویں صدی ہجری تک ہی ملتے ہیں۔ اگرچہ ان میں بعض اطلاعات ایسی بھی ہیں جن کی اصالت اور صحت پر کم تر شک اور تردید کی گنجائش ہے، تاہم کاتبوں کی تحریف ہمارے لیے موجب زحمت بنی ہے۔ بعض اوقات تو شعر میں معمولی سی تحریف سے صورت اور معانی میں عجیب تبدیلی رونما ہو جاتی ہے اور قاری کے لیے ایک مشکل درپیش آتی ہے۔

دوسری قسم کے ماخذ میں مستند اور معتبر تذکرے اور تاریخیں شامل ہیں جو عام طور پر قدما اور متوسطین کے حالات میں تحقیق و تدقیق کی غرض سے دانش مندوں کی توجہ کا مرکز رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ذرایع پہلی قسم کے ماخذ کے مقابلہ میں اجمالی طور پر زیادہ مفصل اور واضح ہیں، اگرچہ حافظ یا کسی دوسرے خاص شاعر، عالم یا دانش مند کے بارے میں سیر حاصل تفاصیل میسر نہ ہوں۔

پروفیسر براؤن نے تاریخ ادبیات ایران میں شبلی نعمانی کے زیر نظر ماخذ و منابع کو دہرایا ہے۔ ان میں "حبیب السیر"، "تذکرۂ مے خانہ"، "تذکرۃ الشعراء"، "بہارستان"، "نفحات الانس"، "آتشکدۂ آذر"، "ہفت اقلیم"، اور "مجمع الفصحا" شامل ہیں۔ البتہ اپنی کتاب کو رشتۂ تحریر میں لاتے وقت "تذکرۂ میخانہ" پروفیسر براؤن کی دسترس میں نہ تھا۔ سنہ ۱۹۳۶ء کتاب لاہور کالج میں عربی کے پروفیسر محمد شفیع نے اردو زبان میں مقدمہ اور حواشی کے ساتھ چھاپی۔ ان تذکروں کے علاوہ اور بھی کئی ماخذ ہیں جو غالباً پروفیسر براؤن یا شبلی کی دسترس میں نہ تھے، اور محققوں نے ان سے حتی الامکان استفادہ

یہ بیت حافظ کی اس مطلع کی غزل کا ہے:

سحر با باد می گفتم حدیث آرزومندی   خطاب آمد کہ واثق شو بالطاف خداوندی

پروفیسر براؤن نے متذکرہ شعر کو یوں درج کیا ہے اور اس کے علاوہ کئی اور لوگوں نے بھی اس طرح لکھا ہے:

بشعر حافظ شیرازی می رقصند و می نازند

سیہ چشمان کشمیری و ترکانِ سمرقندی

ڈاکٹر قاسم غنی نے شاہ شجاع کے بیٹے زین العابدین کی حکومت کا ذکر کرتے ہوئے حافظ کے ان دو اختلافی شعروں کے قضیہ کو اپنی دانست میں حل کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ غزل کا اشارہ زین العابدین کی طرف ہے۔ دراصل غزل کا مقطع یوں تھا:

بخوبان دل مدہ حافظ ببین آن بی وفاییہا

کہ با خوارزمیان کردند ترکان سمرقندی

لیکن بعد میں جب تیمور ۸۹، ہجری میں فارس پر حملہ آور ہوا تو خواجہ حافظ نے مصلحتاً مقطع کو یوں بدل دیا ہے

بشعر حافظ شیرازی می گویند و می بازند

سیہ چشمان کشمیری و ترکان سمرقندی

▲

دورِ جدید کے ایرانی اور غیر ایرانی بالخصوص یورپی محققوں کی نگارشات ہیں۔ ان کی روش عام طور سے یہ رہی ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو، تذکروں، تاریخوں، اور دیگر قدیم مآخذوں میں دماغ سوز تحقیق کی جائے اور مفروضات اور قیاسات سے دور رہ کر اصل واقعات کی روشنی میں کوئی رائے قایم کی جائے۔ اس کاوش کا نتیجہ ایک تو یہ ہوا کہ بہت سارے مآخذوں کو گوشۂ گمنامی سے نکال کر منظر عام پر لایا گیا اور دوسرے یہ کہ سابقہ تذکروں اور تاریخوں میں مندرج بعض اہم واقعات کی تصدیق و تردید کرنے میں کم و بیش مدد ملی ہے اور بہت سارے تاریخی اور غیر تاریخی واقعات کے چہروں سے ابہام اور مغائرت کا حجاب اٹھ گیا ہے۔

مغایرت

بڑے اطمینان اور خوشی کی بات ہے کہ دورِ جدید میں رضا شاہ کبیر نے ایران کی اقتصادی، سماجی اور تمدنی رگوں میں نیا خون دوڑایا اور ترقی کی نئی راہیں لوگوں کے لیے کھول دیں۔ ایران میں وطنیت کا جذبہ ایک بار پھر شد و مد سے ابھرا، اور ایرانیوں نے منجملہ دیگر مساعی کے، ایرانی ادب اور اپنے شاعروں اور اہلِ دانش کو بہتر طریقے سے اپنی ملت میں روشناس کرانے کا کام ہاتھ میں لیا ہے۔ جدید سائنسی انکشافات، اور تکنیکی تسہیلات کی مدد سے ایران کے مدفون علمی اور ادبی خزانوں کو بازیاب کرنے، انھیں منظر عام پر لانے اور ان سے ثقافتی شہرت میں اضافہ اور استحکام حاصل کرنے میں بڑی مدد ملی ہے۔ یورپ کے زیرِ اثر علمی تحقیق نے اپنی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔

گذشتہ

گزشتہ ~~بیس تیس~~ برسوں میں یعنی محمد رضا شاہ پہلوی کے دور میں غیر معمولی رفتار سے کتابیں چھاپنے اور نئی کتابیں لکھنے کا کام جاری ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ چھپائی میں سرعت کے علاوہ نفاست کو بھی ملحوظ نظر رکھا جاتا ہے اور صحت عبارت کی طرف خاص توجہ دی جاتی ہے۔ اسی زمانہ میں ایران کی مردم خیز زمین سے کئی مشہور

کیا ہے۔ گو ان دیرآشنا تذکروں سے حافظ کے حالات کی جانکاری میں کوئی خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوتا تاہم ان کو غیر لازمی قرار دے کر نظر انداز کرنا اصول تحقیق کے منافی ہے، اس قسم کے ماخذ میں یہ کتابیں شامل کی جاسکتی ہیں:۔ بایقرا

(۱) مجالس العشاق :۔ اس کو سلطان حسین بالقرا سے منسوب کیا جاچکا ہے، اگرچہ بعض محققوں کے نزدیک اس میں شک و تردید کی گنجائش باقی ہے۔ بابر نے اپنی تالیف بابر نامہ میں اس انتساب کو نہیں مانا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ کتاب ایک شخص بنام کمال الدین گازرگاہی کی تالیف ہے، وہ صوفی منش آدمی تھا اور میر علی شیر نوائی کی مجلسوں میں اکثر آیا جایا کرتا تھا۔ بہر حال اس کی تاریخ تالیف ۹۰۸ ہجری ہے اور مطبع نولکشور میں ۱۳۱۳ء میں چھپ چکی ہے۔

(۲) عرفات العاشقین : یہ تقی بن معین الدین اوحدی (۱۰۲۲ ہجری) کی نگارش ہے۔ اس کا عکسی نسخہ آقای محمد سہیلی خوانساری کے پاس موجود ہے۔ اس میں حافظ سے متعلق کئی دلچسپ اشارات ہیں۔ الدارائی

(۳) لطائف الخیال :۔ یہ محمد بن الدرائی کی تالیف ہے، اور غالباً ۱۰۶۷ ہجری میں مکمل ہوئی ہے۔ اس کا نسخہ کتاب خانہ ملک تہران، زیر شمارہ ۴۳۲۵ میں موجود ہے۔

(۴) خلاصۃ الافکار، تالیف ابوطالب تبریزی (۱۲۰۵ھ) زیر شمارہ ۴۳۰۱ کتاب خانہ ملک تہران۔

(۵) ریاض الشعراء :۔ تالیف علی قلی خان والہ داغستانی (۱۱۶۱ھ) زیر شمارہ ۴۳۰۱ کتاب خانہ ملک تہران۔

معاصرین کی تحقیق

تیسری قسم کے ماخذ جو دراصل تحقیق کے نام سے پکارے جائیں تو بہتر ہے۔

مرحوم ڈاکٹر قاسم غنی نے حافظ کے زمانے اور تاریخ تصوف پر سب سے اہم تحقیقی کام انجام دیا ہے۔ اور اس کی کتاب "تاریخ عصر حافظ" کے عنوان سے دو جلدوں میں تہران میں چھپ چکی ہے۔ انھوں نے فارسی ادب کے دور معاصر کے ایک اور زبردست محقق یعنی علامہ محمد قزوینی کے ساتھ مل کر بڑی عرق ریزی کے بعد دیوان حافظ کو نہایت عمدہ مقدمہ کے ساتھ چھاپا ہے۔ یہ مقدمہ اور "تاریخ عصر حافظ" پر علامہ محمد قزوینی کا مقدمہ میرے نزدیک حافظ کی شاعری اور منجملہ امور پر نہایت قابلِ قدر مقالہ ہے۔[1]

ڈاکٹر علی اصغر حکمت نے "درسی از دیوان حافظ" کے نام سے دو حصوں پر مشتمل ایک تحقیقی کتاب لکھی ہے۔ پہلا حصہ "نظام تربیت اور تعلیم" موضوع کے تحت حافظ کے صفات، سلوک۔ کسب علم وغیرہ بارہ فصلوں پر مشتمل ہے۔ اور دوسرا حصہ "معارف معنوی" کے عنوان سے مصطلحات حافظ پر بحث ہے۔ اس دانشمند اور صاحب ذوق ایرانی نے پروفیسر براؤن کی "ایران کی ادبی تاریخ" کے ایک حصہ کو "از سعدی تا جامی" کے عنوان سے انگریزی سے فارسی میں ترجمہ کیا اور اس پر نہایت مفید اور قابلِ قدر حاشیے بھی لکھے۔

سیف پور فاطمی نے "شرح حال لسان الغیب" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں حافظ کی سوانح حیات، نقد آثار و تحلیل اشعار پر کام کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ رضا زادہ شفق نے لکھا ہے۔ جس کا موضوع "موازنۂ حافظ و گوئٹے" ہے۔ اختصار کے باوجود، یہ کتاب بڑی مفید اور تاریخی مواد سے بھرپور ہے، اور حافظ کے شرح احوال پر مزید تحقیق کے لیے اچھی رہنمائی کر سکتی ہے۔

اُستاد سعید نفیسی نے "اشعار و احوال حافظ" کے عنوان سے ایک کتاب میں غزلیات پر ان کی اصالت اور انتساب کے لحاظ سے بحث کی ہے۔ چونکہ استاد نفیسی نے دیوان کا عمیق اور ایرانی تمدن کا وسیع مطالعہ کیا ہے، اس لیے ان کا مطالعہ بہت دلچسپ اور مفید ہے۔

معروف دانش مند اور محقق پیدا ہوئے جن کی ادبی اور علمی خدمات فراموش نہیں کی جاسکتیں، مثال کے طور پر دیوان حافظ کو ہی لے لیجیے۔ اس کے صحیح ترین اور معتبر ترین نسخے کی تدوین اور طباعت کے لیے ذاتی اور سرکاری طور پر سالہا سال کام ہوتا رہا، اور بڑی خاصی رقم خرچ کی گئی۔ دنیا کے تمام کتابخانوں میں موجود قلمی نسخوں کی فوٹو کاپی حاصل کی گئی۔ تمام دستیاب نادر تذکروں اور تاریخوں کو سامنے رکھا گیا اور پھر کہیں جا کر وزارت فرہنگ و تعلیم ایران نے اپنے وقت کے دو مشہور عالموں یعنی میرزا محمد قزوینی اور ڈاکٹر قاسم غنی کی راہنمائی میں ایک مستند اور معتبر دیوان حافظ چھپوایا۔ جو شخص اس نسخہ کی تدوین میں کاوشوں کی تفصیل سے آگاہ ہونا چاہتا ہے، اسے اس کا مقدمہ پڑھنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ بیسیوں نسخے ہیں جو ذاتی ذوق اور کاوش کے نتیجے میں چھاپے گئے اور اب آسانی سے دستیاب ہیں۔

دورِ حاضر میں حافظ شناسوں کی تعداد ایران میں اور ایران سے باہر خاصی ہے اور اس میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ حافظ پران میں سے کئی لوگوں کی نگارشات اہم بھی ہیں، اور دلچسپ بھی۔ ہم اس کتاب میں ان تمام ماخذوں کا ذکر کریں گے جو دورِ حاضر کی تلاش سے تعلق رکھتے ہوں، اور حافظ پر مبسوط کام کرنے والوں کے لیے فائدہ مند ثابت ہو سکتے ہیں۔

سب سے پہلے حسین پژمان کے ۱۳۱۵ ہجری میں مرتبہ دیوان حافظ کا ذکر ضروری ہے۔ ۱۳۱۸ھ میں اس کا دوسرا ایڈیشن چھپا جس پر پژمان نے ۱۶۸ صفحات کا سیر حاصل اور سود مند مقدمہ لکھا۔ اس میں کئی موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے، اور ایسے واقعات کا ذکر کیا گیا ہے جن سے حافظ کی زندگی پر کسی حد تک مزید روشنی پڑتی ہے۔ اگرچہ یہ مقدمہ ایک جامع کاوش کا نتیجہ ہے، تاہم اس میں درج اطلاعات حافظ کی خارجی زندگی سے ہی متعلق ہیں۔ داخلی موضوعات یعنی معنویات۔ افکار و عقاید، مذہب، تصوف وغیرہ پر کمتر، بلکہ بہت سرسری توجہ دی گئی ہے۔ بہرحال یہ مقدمہ اپنی جگہ بہت اہم ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایڈیشن کے متن کو بھی بڑی کاوش اور تحقیق کے بعد مرتب کیا گیا ہے۔

کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

انگریزی زبان میں حافظ پر تحقیق کرنے والوں کی تعداد خاطر خواہ ہے۔ مس جیرٹروڈ بل (MISS GERTRUDE BELE) نے حافظ کی منتخب غزلوں کا انگریزی ترجمہ ایک مفصل اور جامعہ مقدمہ کے ساتھ لندن میں چھاپا۔ اس دانشمند خاتون کی حافظ پر قابل قدر تحقیق اور تدقیق کی پروفیسر براؤن نے بڑی تعریف کی ہے۔ مس بل نے منجملہ دیگر توضیحات، حافظ کا اٹلی کے مشہور شاعر دانتے کے ساتھ موازنہ کیا ہے۔ پروفیسر براون نے مس بل کے ترجمہ سے بڑا استفادہ کیا ہے اور اُس کے متوازن اور پُر مغز مقدمہ کی بہت تعریف کی ہے۔

دوسری مفید تحریر جس میں حافظ کے احوال و آثار پر قابل قدر روشنی ڈالی گئی ہے، سر گور اوزلی (SIR GORE OSELEY) کی ہے۔ اس میں حافظ سے متعلق کئی حکایات کو بھی درج کیا گیا ہے۔ اور پروفیسر براؤن نے حافظ کا ذکر کرتے وقت اس کتاب سے بھی کافی استفادہ کیا ہے۔

ہرمن بکنل (HERMANN BICKNELL) نے بھی حافظ کی کچھ منتخب غزلوں کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے اور اس کے احوال کو دلچسپ انداز کے ساتھ پیش کیا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی کئی انگریزی تراجم موجود ہیں، جن کے مقدموں میں مفید مطالب لائے گئے ہیں، ان کی فہرست اختصار کے ساتھ درج کی جاتی ہے:-

1. A specimen of Persian poetry by John Richardson, London 1774
2. Selected odes from the Persian poet Hafiz by John Nott, London 1787
3. The song of the Reed and other pieces by E.H. Palmer, 1877

عبدالرحیم خلخالی نے "حافظ نامہ" کے عنوان سے آثار و احوال حافظ پر ایک رسالہ لکھا ہے جس میں کچھ نئے اور تازہ مطالب زیر بحث لائے گئے ہیں۔

میرے بزرگوار استاد مرحوم ڈاکٹر محمد معین نے "حافظ شیرین سخن" کے نام سے ایک رسالہ لکھا ہے جس میں حافظ کے سوانح کے علاوہ اُس کے افکار و عقاید پر عالمانہ بحث ہے۔

محمد علی بامداد نے "الہامات خواجہ یا حافظ شناسی" کے نام سے اپنی کتاب میں حافظ کے مسلک اور طریقہ پر روشنی ڈالی ہے۔

مجید یکتائی نے ۱۳۲۸ھ میں تصحیح اور مقدمہ کے ساتھ دیوانِ حافظ کو چھپوایا۔ مقدمہ میں حافظ سے منسوب اشعار کی صحت وغیرہ پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ مصحح نے بڑی جستجو کی ہے کہ حافظ کی زندگی سے متعلق نئے خیالات اور نامعلوم واقعات کو سامنے لایا جائے۔ لیکن بعض اوقات چونکہ انھوں نے اپنے کام میں بہت سی نئی بحثیں چھیڑی ہیں، اس لیے بہت سی باتیں بے دلیل اور بے ثبوت بن کر رہ گئی ہیں۔ از

آخر میں علی دشتی کی کتاب "نقشی از حافظ" کا ذکر کرنا ضروری ہوگا۔ اس کتاب کے تین حصے ہیں۔ یعنی تین عنوانوں "حافظ در عالم لفظ"، "حافظ در جہان اندیشہ" اور "ہنر حافظ" کے تحت بحث کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ کچھ اور موضوعات کو ضمناً زیر بحث لایا گیا ہے۔

جدید زمانے میں شبلی نعمانی نے "شعر العجم" میں حافظ کی زندگی اور اس کی شاعری پر بصیرت افروز روشنی ڈالی ہے۔ شبلی کا اپنا مخصوص ناقدانہ ڈھنگ ہے۔ پروفیسر براؤن نے یہ اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے حافظ کے بیشتر حالات "شعر العجم" سے لیے ہیں۔

یہ تو ایرانی (باستثنائے شبلی) محققوں اور ناقدوں کا ذکر تھا۔ البتہ یورپ میں کئی قابل قدر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ جن میں حافظ کی شاعری کے داخلی اور خارجی عناصر کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہم قارئین کی سہولت کے لیے ذیل میں یورپ میں حافظ پر کام کرنے والے محققوں کی فہرست مع اضافات درج کریں گے، جن میں حافظ کی غزلوں کا انگریزی میں ترجمہ کرنے والوں

ملاحظہ ہوں :-

	اصل شعر	بعد تحریف
(۱)	خوش وقت بوریا و گدائی و خواب امن کاین عیش نیست درخور اورنگ خسروی	خوش فرش بوریا و گدائی و خواب امن کاین عیش نیست درخور اورنگ خسروی
(۲)	دانی کہ چنگ و عود چہ تقریر میکنند پنہان خورید بادہ کہ تعزیر میکنند	دانی کہ چنگ و عود چہ تقریر میکنند پنہان کنید بادہ کہ تکفیر میکنند
(۳)	یار دلدار من ار قلب بدینسان شکند ببرد زود بجانداری خود پادشہش	یار دلدار من ار قلب بدینسان شکند ببرد زود بسرداری خود پادشہش
(۴)	زہد رندان نوآموختہ راہی بدہیست منکہ بدنام جہانم چہ صلاح اندیشم	زہد رندان نوآموختہ راہی بدنیست منکہ بدنام جہانم چہ صلاح اندیشم

گزشتہ چند برسوں سے ایران میں بڑی کاوش ہو رہی ہے کہ صحیح ترین اور معتبر ترین دیوان مرتب کر کے چھاپا جائے۔ چنانچہ اب تک ایسے چار دیوان چھپ چکے ہیں۔

دیوان حافظ، بکوشش عبدالرحیم خلخالی، بکوشش حسین پژمان۔ بکوشش ڈاکٹر قاسم غنی و محمد قزوینی۔ اور بکوشش ہاشم رضی۔

بہر حال دیوان حافظ کے غیر معتبر یا معتبر لیکن قدیم ترین نسخوں کو تاریخی ترتیب سے جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ ترتیب اس طرح ہے:-

4- Versions from Hafiz, an essay in Persian metre by Walter Leaf 1898.

5 The poems of Shamsuddin Mohamad Hafiz Shiraz by John Payne

جہاں تک پروفیسر براؤن کی تحقیق کا تعلق ہے، وہ خود معترف ہے کہ اس کے مآخذ کی بنیاد شبلی کی "شعر العجم" ہے۔ بہر صورت حافظ پر اس کی تحقیق قابل ستائش ہے۔

انگریزی زبان کے علاوہ فرانسیسی۔ جرمنی۔ لاطینی اور ترکی زبانوں میں حافظ پر بڑا کام کیا گیا ہے۔ یورپ کی کئی اور زبانوں میں حافظ کی غزلیات کا ترجمہ ہوا ہے، اور ان پر تبصرے چھپے ہیں۔

(یہ تفصیلات ہاشم رضی کے چھاپے ہوئے دیوان حافظ (ص ۳۸-۳۹) سے اخذ کی گئی ہیں۔)

fn

دیوان حافظ کے قدیم قلمی نسخہ جات

حافظ کا دیوان تو فارسی ادب سے دلچسپی رکھنے والے تقریباً ہر شخص کی نظروں سے گزرا ہوگا۔ ایران میں شاید ہی کوئی ایسا گھر ملے گا جس میں دیوان حافظ موجود نہ ہو۔ اس مقبولیت کے باوجود یہ امر یقینی ہے کہ کوئی بھی ایک نسخہ دوسرے نسخہ سے مکمل مطابقت نہیں رکھتا۔ یعنی یہ کہ کچھ نہ کچھ اختلاف مابین تو ہے۔ یا تو ایک نسخہ میں کوئی اضافی غزل ہوگی جس کو حافظ سے منسوب کیا گیا ہے، یا یہ کہ اصل سے حذف کی گئی ہو۔ تحریف تو فارسی دیوانوں میں عام طور پر ہوئی ہے، اس لیے یہ بتانا مشکل ہے اور غیر یقینی بھی کہ کونسا نسخہ ہر لحاظ سے معتبر اور مستند ہے۔ بعض اوقات تو ان اختلافات کی بنا پر ہمیں بڑی زحمت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ دیوان حافظ میں جتنی تحریف یا بقول ناسخان "اصلاح" ہوئی ہے، وہ حد سے باہر ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار

چار سو نوے ہے۔ تاریخ کتابت نسخہ کے آخر میں صریح عبارت میں درج ہوئی ہے۔ کاتب کی عبارت یوں ہے:

"تم الدیوان اوایل شہر جمادی الاول لسنۃ سبع وعشرین وثمانمائۃ الھجریۃ"

یعنی ۸۲۷ ہجری۔

گویا حافظ کی وفات کے صرف پینتیس سال بعد اس نسخہ کی کتابت ہوئی ہے۔

خلخالی کا قول ہے کہ اب تک اس سے قدیم تر نسخہ نہ تو ایران میں ہی دستیاب ہو سکا ہے اور نہ ایران سے باہر کسی ذاتی یا سرکاری کتابخانہ میں۔ البتہ بقول علامہ قزوینی اس میں بھی کئی غلطیاں ہیں جو چھپے ہوئے دیوان میں برقرار رکھی گئی ہیں اور انھیں درست کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔

یہ ان قدیم نسخوں کی فہرست ہے جو ہماری دسترس میں ہیں۔ گیارھویں صدی ہجری سے آج تک بہت سے قلمی نسخے لکھے گئے ہیں۔ اُن کی تعداد معقول ہے اور وہ ایران میں یا ایران سے باہر کتابخانوں میں آسانی سے مل سکتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں قدیم ایرانی ناسخوں اور کاتبوں کے طریقۂ کتابت کے مطابق کئی مجموعے ملتے ہیں، جن کے حاشیوں پر یا تو مکمل دیوان حافظ کی غزلیات درج کی گئی ہیں یا اس کی منتخب غزلیں ہیں۔ تہران یونیورسٹی کے ایک استاد ڈاکٹر خانلری نے ایسے ایک مجموعہ سے غزلیات حافظ کا بقول اُن کے قدیم ترین نسخہ دستیاب کر کے ۱۳۴۸ ہجری شمسی مطابق ۱۹۶۹ء میلادی تہران میں چھپوایا۔ چھپا ہوا دیوان راقم الحروف کی نظروں سے گذرا ہے اور کشمیر یونیورسٹی کے کتاب خانہ مرکزی میں موجود ہے۔ ڈاکٹر خانلری کا قول ہے کہ یہ نسخہ خلخالی کے نسخہ سے دس سال پہلے لکھا جا چکا تھا۔ زیر نظر مجموعہ برٹش میوزیم میں تحت شمارہ ۲۷/۲۶۱ موجود ہے اور ریو نے فہرست کتاب ہائی فارسی A catalogue of Persian Books جلد دوم کے صفحہ ۸۶۸ پر اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ مجموعہ جمادی الاول ۸۱۳ ہجری سے لے کر جمادی الثانی ۸۱۴ھ کے درمیان امیر تیمور کے پوتے اسکندر بن عمر شیخ میرزا کے لیے لکھا گیا تھا۔ اس کے دو کاتب ہیں۔ ایک محمد حلوائی، اور دوسرا ناصر الکاتب۔ شاہزادہ اسکندر اس زمانے میں اپنے چچا شاہرخ کی طرف سے فارس پر حکومت

	نشانی قلمی نسخہ	سال کتابت
۱۔	نسخہ عبدالرحیم خلخالی۔ تہران۔	۸۲۷ ھجری
۲۔	نسخہ باڈلین۔ آکسفورڈ۔ انگلستان۔	۸۲۳ ھ
۳۔	نسخہ کتابخانہ خصوصی مسٹر چیسٹر بیٹی۔ انگلستان۔	۸۵۳ ھ
۴۔	نسخہ مجلس شورای ملّی۔ تہران۔	۸۵۲ ھ
۵۔	نسخہ برٹش میوزیم۔ لندن۔	۸۵۵ ھ
۶۔	نسخہ دیوان حافظ، کتابخانہ ملی۔ پیرس۔ فرانس۔	۸۵۷ ھ
۷۔	نسخہ دیوان حافظ، کتابخانہ شوری ملّی تہران۔	۸۵۸ ھ
۸۔	نسخہ دیوان حافظ، کتابخانہ لیدن۔ ہالینڈ۔	۸۹۴ ھ
۹۔	نسخہ دیوان حافظ۔ کتابخانہ ملی ویانا، آسٹریا۔	۹۰۰ ھ
۱۰۔	نسخہ دیوان حافظ، کتابخانہ شخصی، سید نصراللہ تقوی، تہران۔	۹۰۵ ھ
۱۱۔	نسخہ دیوان حافظ۔ مدرسہ سپہ سالار۔ تہران۔	۹۱۰ ھ
۱۲۔	نسخہ دیوان حافظ، السنہ شرقیہ، پیٹرز برگ۔ روس۔	۹۳۹ ھ
۱۳۔	نسخہ دیوان حافظ۔ کتابخانہ برلن۔ جرمنی۔	۹۴۲ ھ
۱۴۔	نسخہ دیوان حافظ۔ کیمبرج یونیورسٹی۔ انگلستان۔	۹۷۳ ھ
۱۵۔	نسخہ دیوان حافظ، کتابخانہ ملی، قاہرہ۔ مصر۔	۹۷۶ ھ
۱۶۔	نسخہ دیوان حافظ، کتابخانہ ملک تہران	۹۸۲ ھ
۱۷۔	نسخہ دیوان حافظ، انڈیا آفس لائبریری۔ لندن۔	۱۰۰۴ ھ

اس فہرست میں قدیم ترین نسخہ عبدالرحیم خلخالی کا ہے جس کی رو سے انھوں نے ۱۹۲۷ء میں ایک دیوان چھاپا تھا۔ یہ نادر نسخہ نستعلیق خط میں غزلیات کا مکمل دیوان ہے۔ البتہ اس میں کوئی مقدمہ ہے اور نہ حافظ کے قطعات یا رباعیات۔ غزلوں کی تعداد

مسلمان بن جاتے ہیں اور کبھی رندلاابالی کبھی زاہد خشک اور واعظ باصفا، کبھی عارف اور کبھی کامل او مہینٹ کے مظہر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ شاہ شجاع کا حافظ کی غزلوں پر اعتراض اسی قسم کا تھا اور جواب میں حافظ نے کہا کہ میری غزل میں ایک دو شعر شراب پر اک دو تصوّف پر اور باقی عشق مجازی پر ہوتے ہیں، اور ان میں بظاہر کوئی ربط نہیں۔ لیکن اس کے باوجود میری غزلیں تمام ایران میں لوگوں کی زبان پر ہیں اور حریفوں کی غزلیں شہر کے دروازے سے باہر تک بھی نہیں پہنچتی۔ ایرانیوں کی اس متغیر نفسیاتی حالت کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے استاد علی اصغر حکمت نے گلستان سعدی کے باب دوم میں مندرج اس قطعہ کو بطور دلیل نقل کیا ہے۔

یکی پرسید ازان آن گم گشتہ فرزند	کای روشن روان پیر خردمند
زمصرش بوی پیراہن شنیدی	چرا در چاہ کنعانش ندیدی
بگفت احوال ما برق جہان است	دمی پیدا و دیگر دم نہان است
اگر درویش در یک حال ماندی	سر و دست از دو عالم برفشاندی

(از سعدی تاجامی صفحہ ۲۹۸)

بہرحال پروفیسر براؤن کا خیال ہے کہ دیوان حافظ کی بہترین اور مفید ترین شرحیں ترکی زبان میں لکھی گئی ہیں۔ ان میں تین مشہور ہیں یعنی (۱) شرح سروری (۲) شرح شمعی (۳) شرح سودی۔ شرح سروری مصطفیٰ ابن شعبان متخلص بہ سروری شوقی بسال ۹۶۹ ہجری نے دیوان حافظ کی شرح موت سے صرف تین سال پہلے لکھی تھی شمعی ۱۰۰۰ ہجری میں فوت ہوا تھا، اس نے دیوان حافظ کی شرح ۱۰۰۶ ہجری میں لکھی تھی۔ ان دونوں شارحین کا حوالہ حاجی خلیفہ نے "کشف الظنون" میں دیا ہے۔

علامہ محمد قزوینی نے مقدمہ دیوان حافظ (صفحہ فح) فلوگل (FLOGGIL) کے ویانا والے کتاب خانہ میں قلمی نسخہ جات کی فہرست کے حوالہ سے سودی کی وفات ۱۰۰۰ھ بتائی ہے۔ کیونکہ اس کتاب خانہ میں اسی سودی کی بوستان سعدی پر بھی شرح موجود ہے۔

متوفی

کرتا تھا۔ ۷۱۸ھ میں سلطان کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے کے نتیجہ میں اس نے شکست کھائی اور مارا گیا۔

(غزلہای حافظ شیرازی بکوشش دکتر پرویز ناتل خانلری صفحہ ۹)

یہ سطور تحریر کرتے وقت مؤلف کو اطلاع ملی ہے کہ دیوان حافظ کا ایک اور قلمی نسخہ ہندوستان میں گورکھپور کے مقام پر ہاشم علی سبزپوش کے کتابخانہ میں موجود ہے، جس کی کتابت ۸۲۴ ہجری کو ہوئی بتلائی جاتی ہے۔ اس نسخہ کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر نذیر احمد اور ایران کے ایک دانشمند جلالی نائینی نے باہمی ہمکاری سے تہران میں چھاپا ہے۔ پروفیسر نذیر احمد کا دعویٰ ہے کہ یہ دیوانِ حافظ کا قدیم ترین نسخہ ہے جو ہماری دسترس میں ہے۔

دیوان حافظ کی شرحیں

دیوان حافظ کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں۔ یہ نہ صرف فارسی زبان میں ہیں بلکہ انگریزی ترکی اور اردو کے علاوہ غالباً کئی یورپی زبانوں میں لکھی جا چکی ہیں، لیکن اکثر شرحیں مشرقی زبانوں میں مروج شعروں کی تفسیر سے آگے نہیں بڑھی ہیں۔ چنانچہ پروفیسر براؤن نے بھی شکایت کی ہے کہ اس تک پہنچی ہوئی شرحوں میں صحیح انتقادی پہلو کا ازبس فقدان ہے۔

حافظ کے شارح اکثر افراط یا تفریط کے شکار ہوتے ہیں۔ کبھی تو وہ اس کی غزلیات میں مجاز کے بغیر اور کسی دوسرے پہلو کو قبول نہیں کرتے اور کبھی ہر شعر کو تمثیلی رنگ دے کر اس کی عجیب و غریب تاویل پیش کرتے ہیں۔ اس طرح کی غیر متوازن رائے قائم کرنا اس وجہ سے ہے کہ عام شارح ایرانیوں کی نفسیات سے بخوبی واقف نہیں۔ انھیں علم نہیں کہ یہ قدیم اور تاریخی ملت تاریخ کے درخشاں ترین ادوار سے گزری ہے اور طرح طرح کے تجربات، ان کی معاشرت اور ان کے تمدن کا ضروری حصہ بن چکے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کے مزاج میں ہر چیز کے متضاد پہلوؤں کا عجیب مگر پر لطف امتزاج ہے، وہ ایک ہی دن میں کئی نفسیاتی حالات سے گزرتے ہیں۔ کبھی

مجازی

نے ہر طرح کی مجازی اور تمثیلی تفسیر میں افراط و تفریط سے اجتناب کیا ہے اور مشکل ابیات و کلمات کی خیالی تاویلات کی بے ہودہ کوشش میں اپنا وقت ضائع نہیں کیا ہے۔ سودی نے کل ملا کر ۵۷۳ غزلوں ۴۲ قطعوں ۶ مثنویوں ۲ قصیدوں اور ایک مخمس کو دیوان میں جمع کر کے تشریح کرنے کی کوشش کی ہے

گیارھویں صدی ہجری میں محمد بن محمد دارابی نے "لطیفہ غیبیہ" کے نام سے ایک رسالہ لکھا ۱۲۷ صفحات پر مشتمل یہ رسالہ ۱۳۰۴ھ میں چھپا اور ۱۳۱۹ھ میں دوسری بار شیراز تہران میں میں چھپا شیراز میں چھپے ہوئے نسخہ پر اس وقت کے عارف و عالم آقا میرزا احمد عبدالحی ــــــ مرتضوی تبریزی نے مقدمہ لکھا۔ شاہ سلطان صفوی کے معاصر سید قطب الدین محمد تبریزی (متوفی سال ۱۱۷۰ھ) نے اپنی کتاب "فصل الخطاب" میں شاہ محمد دارابی کے احوال درج کئے ہیں۔ اس کا قول ہے کہ دارابی دارالعلم شیراز میں ایک فاضل استاد تھا اور اس نے معراج الکمال کے نام سے ایک رسالہ لکھا تھا۔ لیکن اس رسالہ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر مؤلف شاہ عباس صفوی دوم کا ہمعصر تھا۔ ابتدا میں اس کی زندگی فارس میں دارالبجیرد کے مقام پر بسر ہوئی اور پھر شیراز آیا۔ جہاں کسب علم میں مصروف رہا۔ ۱۰۸۲ھ کے آس پاس وہ احمد آباد اور گجرات میں تھا۔ میں

رسالہ "لطیفہ غیبیہ" محمد دارابی نے اپنے ہمعصروں کے حافظ پر بعض اعتراض پر بحث کی ہے اور اس سلسلہ میں بعض مشکل اشعار کی توضیح بھی کی ہے۔ دارابی نے اس رسالہ میں تین شدید اعتراضوں کا جواب دینے کی کوشش کی ہے جو حافظ کے معترضین نے اس کی شاعری پر وارد کیے ہیں:۔

اعتراضات یوں ہیں:۔

(۱) حافظ کے بعض ابیات کے معنی معلوم نہیں ہوتے اگر ان میں کچھ معنی ہوں بھی تو ان کی فہم بڑی مشکل ہے مثلاً:

ما جرا کم کن و باز آ کہ مرا مردم چشم ‏ ‏ ‏ ‏ خرقہ از سر بدر آورد و بشکرانہ بسوخت[1]

---

(۱) اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے استاد سعید نفیسی نے "در مکتب استاد" میں لکھا ہے کہ ایک با معنی رتبہ کا صوفی بالا تر رتبہ کے صوفی کے سامنے اپنا خرقہ اتار دیتا تھا۔

جس پر ۱۰۰۶ھ کی تاریخ درج ہے۔ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں سودی کا سال وفات ۱۰۰۰ھ بتایا ہے جو اب غلط معلوم ہوتا ہے۔ سودی عثمانی ولایات کے ایک مقام بوسنہ میں پیدا ہوا تھا عربی اور فارسی ادب پر کافی دسترس رکھتا تھا اور دربار عثمانی میں پیش قدمتوں کا معلم مقرر ہوا تھا۔ حافظ کی غزلوں پر ترکی زبان میں اس کی عالمانہ شرح ۱۲۵۰ھ ہجری شمسی بولاق، مصر میں متن سمیت تین جلدوں میں چھپی۔ یہ شرح تہران اور دوسری جگہوں پر بھی نہایت کمیاب ہے۔ لیکن ایران میں حال ہی میں ایک ایرانی خاتون باسم عصمت ستار زادہ نے اس شرح کا ترکی سے فارسی زبان میں ترجمہ چھاپا جو راقم الحروف کی نظروں سے گزرا ہے۔

خدمتول

۱۸۵۴ء میلادی میں براک ہاز (BROCKhaus) نے لائپزگ (LEIPZIG) میں چھاپے ہوئے دیوان حافظ کے ساتھ سودی کی حافظ کی ایسی غزلوں پر شرح بھی ملحق کر دی ۱۸۷۰ء میلادی میں سودی کی شرح کامل معہ متن ایک ترکی زبان کی شرح کے ضمیمہ کے طور پر استنبول میں چھپی۔

انگریزی زبان جاننے والے اگر سودی کی طرز نگارش سے آگاہ ہونا چاہیں تو مندرجہ ذیل کتابیں پڑھیں:

1. Twelve odes of Hafiz done literally into English together with the corresponding portions of the Turkish commentary of Sudi" W.H. Lowe, Cambridge 1887.
2. English translation of Diwan of Hafiz - Col. H. Wilberforce Clerk.

سودی نے اپنی مشہور شرح کے ساتھ حافظ کی غزلیات کو بھی درج کیا ہے۔ براؤن کا قول ہے کہ سودی کی درج شدہ غزلیں بہت زیادہ قابل اعتبار اور قابل قبول ہیں اور بعد کے نساخ اکثر اسی سے نقل کرتے رہے ہیں۔ علامہ قزوینی نے مقدمہ دیوان حافظ میں اعتراف کیا ہے کہ اس نے سودی کی شرح کے ساتھ ملحق غزلیات حافظ سے استفادہ کیا ہے۔

پروفیسر براون نے سودی کی شرح کو سب سے بہتر اور مفید تر بتایا ہے۔ اس لحاظ سے کہ سودی

مرحوم استاد سعید نفیسی کی کتاب ـــــ بیف پور فاطمی کی شرح حال لسان الیب دونوں شرح کے لحاظ سے بھی مفید کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ سند و مقالات، نگارشات۔ تبصرے اور رسائل حافظ کی شرح و تفسیر کا کام دیتے ہیں۔ ایران سے مختلف ادبی اور علمی رسالوں میں وقتاً چھپتے رہتے ہیں۔ کچھ اور کتابیں حافظ پر لکھی جا چکی ہیں، اور ہم نے پہلے بھی ان کا ذکر کیا ہے

فارسی شرحوں میں "کشف الاسرار" کے نام سے محمد افضل الہ آبادی کی شرح ہے ایک اور شرح "بحر الفراسۃ" نام کی عبداللہ خلیفہ بن عبدالحق نے لکھی ہے۔ اس کی تلخیص بنام "خلاصۃ البحر" بھی ہے۔ فارسی میں ایک اور شرح محمد ابراہیم بن محمد سعید کی ہے، جس میں دشوار اشعار کی طرف زیادہ توجہ دی گئی ہے۔

حال ہی میں مجھے اطلاع ملی ہے کہ شیراز میں پہلوی یونیورسٹی کے ایک حافظ شاش پروفیسر مسعود فرزاد نے اس شاعر پر کئی جلدوں میں تحقیقی کام چھاپنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ غالباً اس کی تحقیق کی کچھ جلدیں چھپ چکی ہیں، جن میں ہماری اطلاع کے مطابق حافظ کی شاعری اور فن کے موضوعات پر بحث ہے۔ البتہ اس سلسلہ کی کوئی کتاب ابھی تک میری نظر سے نہیں گزری ہے۔

۲۔ حافظ کے بعض اشعار شرع کے خلاف ہیں۔ ان میں ہوا و ہوس کے بغیر اور کوئی پہلو نہیں۔ مثلاً ؎

دل من در ھوای روی فرخ — بود آشفتہ تر از موی فرخ

یا

ہزار آفرین بر می سرخ باد — کہ از روی ما رنگ زردی ببرد

۳۔ حافظ کے اشعار مذہب اشعری کے اصولوں سے مطابق ہیں علمای امامیہ انھیں باطل خیال کرتے ہیں۔ مثلاً:

در کوی نیکنامی ما را گذر ندادند — گر تو نمی پسندی تغییر دہ قضا را

یا

این جان عاریت کہ بہ حافظ سپرد دوست — روزی رخش ببینم و تسلیم وی کنم

اس تیسرے اعتراض کے ضمن میں استاد حکمت نے بتایا ہے کہ یورپیوں کا خیال ہے کہ عقیدہ (FATALISM) اسلام کے خاص اصولوں میں سے ہے اور یہ غلط ہے۔ فرقۂ شیعہ کے نزدیک جبر کا عقیدہ مردود ہے، اور آئمہ معصومین کے قول کے مطابق اعتقاد رکھتے ہیں کہ "لا جبر و لا تفویض بل امر بین امرین"

(۱) از سعدی تا حاجی صفحہ ۱۰۴)

دور معاصر میں حافظ کی غزلیات کی شرح و تفسیر کا کام جاری ہے اور اس کے اشعار کے مختلف پہلوؤں پہ غور و خوض کیا جارہا۔ خوش قسمتی سے اس وقت تحقیق و تدقیق کے کام کو انجام دینے کی بڑی سہولتیں میسر ہیں۔ دنیا کے کسی بھی کتاب خانے میں موجود کسی بھی قلمی نسخہ کی فوٹو کاپی قلیل وقت میں حاصل کی جاسکتی ہے۔ دور حاضر میں سب سے پہلے استاد علی اصغر حکمت کی تحقیق "درسی از دیوان حافظ" قابل ذکر ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر محمد معین کی کتاب "حافظ شیرین سخن" باوجود اختصار بڑا عالمانہ مطالعہ ہے۔ یہ کتاب اب نایاب ہے۔

تیسرا باب

حافظ کی زندگی کے حالات

گھرانا:۔ حافظ کے شخصی حالات کو شبلی نعمانی نے عبدالنبی فخرالزمانی کے تذکرۂ میخانہ سے نقل کیا ہے لیکن جیسے کہ پروفیسر براؤن نے اشارہ کیا ہے، شاید شبلی خود اس کو بہت زیادہ قابل اعتبار خیال نہیں کرتے تھے۔ بہرحال حالاتِ زندگی کے سلسلہ میں براؤن نے شبلی کی ہی عبارت کو نقل کیا ہے۔ اور مندرج اطلاعات کی صحت یا عدم صحت کی ذمہ داری کو قبول نہیں کیا ہے۔ حافظ کے اجداد کی جائے سکونت کے متعلق دو روایتیں ہیں۔

ایک یہ کہ وہ اصفہان کے نزدیک "کوپائی"[1] نام کے گاؤں کے رہنے والے تھے

دوسری یہ کہ تویسرکان[2] (فارس) کے تھے۔

---

(۱) "کوپائی" دراصل "کوہ پایہ" کا مخفف ہے جو اصفہان و دیگر مقام کے لوگ اسے کوپای کہتے ہیں۔ کسی جگہ "کوپان" دیکھا گیا ہے (لغت نامہ دہخدا) یاقوت نے معجم البلدان میں اسے اصفہان کا قریہ اور نعمان کے نام سے بتایا ہے۔ (۲) بعض نسخوں میں "توی سرکان" لکھا گیا ہے ...

میں منقسم کیا تھا اور یہ ترتیب اب بھی باقی ہے۔ یعنی محلہ اسحاق بیگ۔ محلہ بازار مرغ۔ محلہ بالا کفہ۔ محلہ درِ شاہ۔ محلہ میدان شاہ۔ محلہ دروازہ کازرون۔ محلہ سرباغ۔ محلہ سروزک۔ محلہ سنگ سیاہ۔ محلہ لبِ آب۔ محلہ گلدستہ۔ محلہ درِ شیخ۔ محلہ سنگ سیاہ کا نام اس وجہ سے ہے کیونکہ وہاں علم نحو کے معروف عالم حکیم سیبویہ کی قبر پر سیاہ رنگ کا پتھر رکھا ہوا ہے۔ شیراز میں یہودیوں کا بھی ایک محلہ ہے، جس کو محلۂ کلیمیان کہتے ہیں۔

اکثر تذکرہ نویس اتفاق کرتے ہیں کہ حافظ کے والد یا جد شیراز میں تجارت کرتے تھے اور ہمیشہ صاحب مکنت تھے۔ کچھ وقت کے بعد ان کی وفات شیراز میں ہوئی۔ بہا الدین کی موت کے بعد ان کے گھر کے حالات خراب ہو گئے۔ ایک بیوہ اور ایک کم سن لڑکا اس کے وارث رہ گئے لیکن صاحب میخانہ کا قول ہے کہ بہا الدین کے تین لڑکے تھے جن میں دو شیراز چھوڑ کر کسب معاش کے لیے کسی دوسری جگہ چلے گئے تھے اور سب سے چھوٹا لڑکا شمس الدین محمد شیرازی شیراز میں ہی اپنی والدہ کے پاس رہا، اور ماں بیٹے دونوں تنگ دستی، اور بے نوائی میں بسر اوقات کرتے رہے۔

۲۔ **ولادت**:۔ چونکہ حافظ کی زندگی کے حالات ابھی تک کسی مستند ذریعہ سے معلوم نہیں ہو سکے ہیں، اس لیے دوسری باتوں کی طرح ان کی تاریخ ولادت کے بارے میں بھی تذکرہ نویسوں کے درمیان اختلاف پائے جاتے ہیں۔

تذکرۂ میخانہ میں بتایا گیا ہے کہ حافظ نے ۶۵ برس کی عمر میں رخت سفر باندھا۔ مگر اس کے سال وفات کو ۷۹۱ھ فرض کریں تو اس کی ولادت ۷۲۶ ہجری ہونی چاہیے۔ اس قول کی تصدیق چند شواہد کی بنا پر ہو سکتی ہے۔ مثلاً شاہ شجاع [illegible]ھ میں کرمان سے واپس شیراز آیا تو کچھ وجوہات کی بنا پر اس نے حافظ کے ساتھ سرد مہری کا سلوک کیا۔ حافظ نے آخر کار سفر کا ارادہ کیا اور ذیل کے مطلع کی غزل کہی:

چل سال بیش رفت کہ من لاف می زنم کز چاکران پیر مغان کمترین منم

دوسری رائے دراصل رضا قلی خاں ہدایت کی پیش کی ہوئی ہے، اور باقی تذکرہ نویسوں نے اسی سے نقل قول کیا ہے۔ براؤن نے رضا قلی خاں کی عبارت میں قلت صحت کی شکایت کی ہے۔ استاد حکمت اور ہاشم رضی نے بھی ہدایت کے قول کو قبول کرنے میں تأمل کا اظہار کیا ہے بخصوص جب کہ اس نے اثبات میں کوئی موثق سند پیش نہیں کی ہے۔ اس کے بنیاد پر کئی تذکروں میں اس بات کی تصدیق ہوئی ہے۔

صاحب تذکرہ میخانہ کا بیان ہے کہ اتابکان فارس(۱) کے زمانے میں نامعلوم وجوہات کی بنا پر انھوں نے اصفہان سے رخت اقامت اٹھا کر شیراز کی راہ لی اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ ہدایت اور فخر الزمانی کے بیانات میں ایک اور اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہدایت نے لکھا ہے کہ حافظ کے "جد" تویسرکان کے تھے۔ اور فخر الزمانی کہتا ہے کہ "جد پدر بزرگ" گویا اصفہان کے تھے۔ ادھر براؤن نے شبلی سے نقل قول کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حافظ کے والد اصفہان سے مہاجرت کر کے شیراز آئے۔ ان متضاد بیانات کے پیش نظر یہ بات یقین سے کہی نہیں جا سکتی کہ آیا حافظ کے والد مہاجرت کر کے شیراز آئے تھے یا ان کے اجداد۔ اصفہان سے یا تویسرکان سے،

جو لوگ حافظ کے والد کو تویسرکان کا بتاتے ہیں، انھوں نے اس کا نام بہاء الدین لکھا ہے اور جو لوگ حافظ کے خاندان کو اصفہان کا مہاجر خاندان خیال کرتے ہیں، وہ کمال الدین بتاتے ہیں صاحب تذکرہ میخانہ کا قول ہے کہ حافظ کی والدہ کازرون (فارس) کی تھیں اور حافظ کا مکان شیراز میں محلہ دروازہ کازرون میں تھا۔ البتہ کئی دیگر روایتوں کے مطابق ان کا گھر دروازہ کازرون میں نہیں بلکہ محلہ شیادان میں تھا۔

حمد اللہ سفونی کے "نزہۃ القلوب" میں لکھا ہے کہ آٹھویں صدی ہجری میں شیراز میں ۱۷ یا ۱۹ محلے تھے۔ شیراز کے ایک نیک مرد اور عادل حکمران کریم خان زند نے شہر کو بارہ محلوں

---

(۱) اسی خاندان کے اتابک سعد بن زنگی کی مدح شیخ سعدی نے کی ہے۔

چونکہ اس مشہور غزل کا ذکر آیا ہے اس لیے ہم اصل موضوع سے تھوڑی دیر کے لیے ہٹ کر اس سے متعلق ایک واقعہ بیان کریں گے:

عبدالحسین ہژیر کی کتاب "حافظ تشریح" میں ایک حکایت درج ہے۔ حافظ کے فن پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے مؤلف نے ضمناً حافظ کی غزلوں میں تحریف اور دخالت پر زور دار بحث کی ہے، اور دیوان حافظ میں پست اشعار کو کاتبوں، ناسخوں اور غیر ذمہ دار شائقوں کی دست اندازی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ اس غزل پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ ایک بار، میں چاندنی رات میں اصفہان کے ایک کوچے سے جا رہا تھا کہ اچانک مجھے ایک اندھا آدمی ملا، جو بڑے سوز و گداز سے حافظ کی یہی غزل نہایت پرسوز لے میں گا رہا تھا۔ اس چاندنی رات میں مجھے اس بے نظیر غزل اور اس کے ساتھ اندھے کی لحن داؤدی نے عجیب کیفیت کی حالت میں ڈال دیا، اور میں از خود رفتہ ہو گیا، گویا میں عالم ارواح میں پہنچ گیا جہاں خالص نور عرفان اور فیض سماوی برس رہے ہوں۔ میں شیراز کے اس لافانی شاعر کی روح [illegible] ہزار درود بھیج رہا تھا کہ یکایک مغنی نے یہ شعر پڑھا:

دریای اخضر فلک و کشتی ہلال

ہستند غرق نعمت حاجی قوام ما

اس غیر موزوں شعر نے مجھے یک دم جھٹکا سا دیا۔ میرے ذوق اور وجد کی کیفیت غائب ہوئی اور وہ قدسی فیض مجھ سے رخصت ہوا۔

اس حکایت سے ناقد نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ بیت کاتبوں اور خوش ذوق لوگوں کی دخالت کا نتیجہ ہے۔ ورنہ غزل میں ایس کا ہونا کسی طرح عقل سلیم کو قبول نہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ اُستاد خانلری کے شائع کردہ دیوان میں زیر بحث غزل میں یہ شعر نہیں ہے اور متن کے

شاہ شجاع کی شیراز میں مراجعت کا سال (۷۶۶ ہجری) مدنظر رکھ کر اس میں سے چالیس
کم کیے جائیں تو سالِ تولد ۷۲۶ ہجری دریافت ہوتا ہے۔ لیکن کچھ تذکرہ نویسوں اور محققوں کا خیال
ہے کہ حافظ کی وفات کے وقت ـــــــ اس کی عمر چھیالیس برس کی تھی۔ اس طرح اس کی
ولادت ۷۴۶ھ میں ہونی ہونی چاہیے۔ اس قول کی تردید میں بڑی زوردار دلیلیں پیش
کی جا سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ ملاحظہ ہوں:-

(۱) اگر شیخ ابو اسحاق اور حافظ کے درمیان دوستی کے آغاز کی تحقیق کریں تو معلوم
ہوگا کہ اُن کے روابط ۷۵۴ھ ہجری سے شروع ہوئے تھے۔ اس لحاظ سے حافظ کی
عمر اُس وقت نو برس کی معلوم ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ نو برس کے لڑکے کی دوستی شاہ
شیخ ابو اسحاق جیسے باوقار اور سخن فہم بادشاہ کے ساتھ ہونی ممکن نہیں۔ ایسی دوستی
بعید از قیاس ہے۔

(۲) حافظ نے حاجی قوام الدین کی تعریف میں یہ مشہور شعر کہا ہے، اگرچہ اس میں تردید
کی گنجائش باقی ہے:

ہستند غرق نعمت حاجی قوام ما   دریای اخضر فلک و کشتی ہلال

حاجی قوام ۷۵۴ھ ہجری میں فوت ہوا تھا اور حافظ نے اس کی وفات کا مادہ تاریخ بھی
نکالا ہے۔ اس لیے اگر فرض کریں کہ حافظ کا سال ولادت ۷۴۶ھ ہے تو یہ ماننا پڑیگا
کہ حاجی قوام الدین کی تعریف میں کہے گئے شعر والی غزل کو حافظ نے نو سال کی عمر ہی
میں کہا تھا۔ جو لوگ اس غزل کے معانی، اس کی معنوی خوبی اور پختگی سے آگاہ ہیں
وہ کبھی قبول نہیں کریں گے کہ نو سال کا لڑکا اتنی پختہ اور شاہکار غزل کہہ سکتا ہے۔
خاص کر یہ شعر جو فارسی شاعری کا لافانی شعر مانا گیا ہے:

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

حافظ کو محلہ کے ایک شخص کے پاس رکھا تاکہ اس کی تربیت کرے اور اس کے مستقبل کے
بارے میں کوئی راستہ نکالے۔ ذرا ہوش سنبھالنے پر حافظ نے اس شخص کی روش کو پسند نہ کیا چنانچہ
"میخانہ" میں یہ جملہ درج ہوا ہے۔ "خواجہ چون خود را شناخت از صانع آن مرد رش خوش نیامد۔
ناچار ایک نانبائی کی دکان میں خمیر گیری کا کام کرنا پڑا۔ پروفیسر براؤن نے تو یہ نہیں لکھا کہ اس عمر میں اسے
خمیر گیری کے کام پر لگایا گیا تھا البتہ یہ کہا ہے کہ اسے محنت شاقہ سے کسب معاش کرنا پڑا۔
"میخانہ" کے علاوہ کئی اور تذکروں میں خمیر گیری کو واضح طور پر لکھا گیا ہے۔ یہ کام آدھی رات
سے لے کر صبح صادق تک کرنا پڑتا تھا۔ اسی وقت سے حافظ سحر خیزی کی عادت پڑ گئی جس کی تصدیق
اُس کے متعدد اشعار سے ہوتی ہے بلکہ سحر خیزی اس کے اشعار کا ایک ضروری عنصر بن کر رہ گئی ہے۔

سحر با باد میگفتم حدیث آرزو مندی
خطاب آمد کہ واثق شو بالطاف خداوندی

اے صبا امشبم مدد فرمای
کہ سحر گہ شکفتنم ہوس است

کہا جاتا ہے کہ نانبائی کی دوکان کے قریب ایک مکتب تھا اور اکثر آسودہ حال
لوگوں کے بچے وہاں پڑھنے آتے تھے۔ حافظ ہر روز اس مکتب کے سامنے سے گزرتا
اور لڑکوں کو سبق پڑھتے دیکھا کرتا۔
ایک دن نہ جانے کس طرح اُس کے دل میں آئی کہ پڑھنا خدا شناسی کا موجب
ہو سکتا ہے چاہیئے کہ اس طرف توجہ دوں ہو سکتا ہے کہ میں خدائے بزرگ و برتر
کی عنایات سے بہرہ ور ہو جاؤں!
چنانچہ بغیر استخارہ اس کار نیک میں ہاتھ ڈالا۔ خمیر گیری سے جو معاوضہ

دیوان میں مقطع کے بعد آیا ہے، جو حافظ کا طریقہ نہیں۔

(۳) حافظ نے قوام الدین مرد صاحب عیار (وزیر) کی مدح میں یہ غزل کہی ہے:

بحسن و خلق و وفا کس بیار ما نرسد ... ترا درین سخن انکار کار ما نرشد

اس میں ایک شعر یوں ہے:

دریغ قافلۂ عمر کانچنان رفتند ... کہ گردشان بہوای دیار ما نرسد

اگر فرض کریں کہ یہ سید ہ اور ستین غزل محمود صاحب عیار کی زندگی کے آخری برسوں یعنی سنہ ۷۸۲ ہجری میں لکھی گئی ہو، تب بھی اس وقت حافظ کی عمر انیس برس سے زیادہ کی نہ ہوگی۔ ظاہر ہے کہ انیس برس کا جوان اول تو اس قدر ستین اور پختہ غزل کہہ نہیں سکتا، اور دوم اگر کہہ بھی سکے، لیکن عمر گزشتہ پر تاسف کیوں کرے گا جب کہ ابھی اس نے مشکل شباب میں قدم رکھا ہو۔

(۴) حافظ نے اپنی غزلوں میں بار با پیری کی طرف اشارہ کیا ہے:

دلا چو پیر شدی حسن و نازکی مفروش ... کہ این معاملہ با عالم شباب رود

گرچہ پیرم تو شبی تنگ در آغوشم گیر ... تا سحرگہ ز کنار تو جوان برخیزم

چون پیر شدی حافظ از میکدہ بیرون آی ... رندی و ہوسناکی در عہد شباب اولی

ظاہر ہے جو شخص صرف چھیالیس برس کی عمر پا چکا ہو، اس نے پیری کا عہد خود دیکھا نہیں اور اس طرح کے اشعار کہنا جن میں پیری کی شکایت ہو منطقیت سے خالی ہے۔

والد کی وفات کے بعد گھرانا پریشان حالی سے دوچار رہا، اور حافظ کی والدہ ..... مستور عسرت میں گذر اوقات کرتی رہیں۔ صاحب تذکرہ مے خانہ نے اس ابتدائی دور میں حافظ کی بے سروسامانی کا ذکر کیا ہے۔ اس کا بڑا بھائی شیراز چھوڑ کر چلا گیا اور ماں نے

"ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے"۔ بطور مثال ... یہ اشعار، میں ساز۔ بم۔ حجاز۔ عراق۔ نوا۔ بانگ۔ شیراز۔ وغیرہ ایرانی علم موسیقی کی اصطلاحیں ہیں۔

ع معاشری خوش و رودی بسازم بخواہم ... "تا در خویش بجوییم به بالا بم و زیر

ع فگندہ زمزمۂ عشق در حجاز و عراق ... نوای بانگ غزلہای حافظ از شیراز

۴۔ تحصیل علم

مدرسہ میں کس عمر تک حافظ تحصیل علم کرتا رہا، علمی تحصیلات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے کن کن اُستادوں سے فیض حاصل کیا، اور قرآن کے علاوہ کن کن کتابوں کا مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا، یہ سب کچھ نامعلوم ہے۔ البتہ کچھ باتیں حکایتوں کے طور ہم تک پہنچی ہیں، جنھیں ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

دولت شاہ سمرقندی نے لکھا ہے کہ:

"شاعری اس کے رُتبہ سے پست ہے۔ تفسیر کلام اللہ مجید اور فرقان حمید میں بے نظیر ہے۔ علوم ظاہر و باطن میں دانش مند بصیر ہے"

محمد گلندام کے مقدمہ میں چند کتابوں کا نام لیا گیا ہے، جن کا حافظ نے مطالعہ کیا تھا۔ اور اسی ضمن میں اکثر تذکرہ نویسوں نے گلندام ہی سے نقل قول کیا ہے۔ بہر حال اگر گلندام کی دی ہوئی اطلاع کو قابل اعتبار خیال کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حافظ نے فارسی ادبی کتابوں کے علاوہ اہم دینی اور تفسیری کتابوں کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ ان کے علاوہ عرب شاعروں کے دیوان اس کی نظر سے گزرے تھے، اور قوانین ادب پر عبارت بھی رکھتا تھا، چنانچہ محمد گلندام کی عبارت یوں ہے:

"...... آنا بواسطہ درس قرآن و ملازمت بر تقویٰ و احسان و بحث کشاف و مفتاح

حاصل ہوتا اس کے چار حصے کر دیتا۔ تین حصوں کو اپنی والدہ، معلم اور فقرا میں بانٹ دیتا تھا اور چوتھا حصہ اپنے اخراجات کے لیے رکھ لیتا۔

توفیق ایزدی نے ساتھ دیا اور اس نے قرآن شریف حفظ کر لیا۔ ایسا لگتا ہے کہ اس زمانے میں قرآن شریف حفظ کرنے والوں کا ایک خاص طبقہ تھا جو اپنے آپ کو حافظِ قرآن یا صرف حافظ کہلواتا تھا۔ تاریخ ایران میں کئی حافظانِ قرآن کا نام آتا ہے۔ ہمیں حافظ کے کئی اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ واقعی حافظِ قرآن تھا۔ مثلاً

؎ عشقت رسد بفریاد گر خود بسان حافظ — قرآن ز بر بخوانی با چار دہ روایت

؎ ندیدم خوشتر از شعر تو حافظ — بقرآنی کہ اندر سینہ داری

؎ ز حافظان جہان کس چو بندہ جمع نکرد — لطائفِ حکمی با نکاتِ قرآنی

دیوان حافظ پر محمد گلندام کے مقدمہ سے پتہ چلتا ہے کہ قرآنی درس سے فراغت نہ ملنے کی بنا پر حافظ اپنی غزلوں کو اکٹھا نہ کر سکا۔ چنانچہ عبارت یوں ہے:

"... اما بواسطۂ محافظت درس قرآن و ملازمت بر تقوی و احسان ....
بہ جمع اشتات غزلیات نپرداخت"

یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ قرآن حفظ کرنے کی بنا پر ہی اس نے حافظ تخلص اختیار کیا چنانچہ صاحب تذکرہ میخانہ نے اس ضمن میں لکھا ہے: "یکی از اکابر بخواجہ فرمود کہ چون از سعادت قرآن دانی و فرقان خوانی مستفید بہرہ ور شدہ ای باید کہ تخلص خود را حافظ نمائی۔ شمس الدین بنا بگفتۂ آن عزیز تخلص خود حافظ نمود۔" اکابر میں سے وہ کون تھا جس نے حافظ تخلص اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہمیں معلوم نہ ہو سکا۔

حافظ کے متعدد اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خوش الحان تھا جو قرأت قرآن پڑھنے میں یکتا تھا چنانچہ

ز چنگ زہرہ شنیدم کہ صبحدم میگفت — غلام حافظ خوش لہجۂ خوش آوازم

غالباً حافظ موسیقی سے بھی آشنا تھا چنانچہ اس کی غزلوں میں ایسے بہت اشعار ہیں جن میں ایرانی موسیقی سے متعلق اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں لیکن اس علم میں اس کی استعداد کس قدر

دیکھنے میں نہیں آئی، بلکہ صرف اتنا ہی لکھا گیا ہے کہ حافظ نے ان کتابوں کا خود سے مطالعہ کیا ہے۔

عباس اقبال کا قول ہے کہ "کشف کشاف" ایک تفسیر کا نام ہے جو حافظ کے ایک ہمعصر اہلِ فارس نے لکھی تھی۔ کچھ اور لوگوں کا خیال ہے کہ یہ شخص (یا اس کے علاوہ کوئی دوسرا شخص) سراج الدین عمر بن عبدالرحمان فارسی قزوینی تھا جو ۷۴۵ھ ہجری میں فوت ہوا تھا۔ وہ حافظ کے استاد قوام الدین عبداللہ اور مجد الدین فیروز آبادی صاحبِ قاموس کا شاگرد تھا۔ کتاب کا اصل نام "الکشف عن المشکلات الکشاف" تھا۔

(۱ سخنی چند در باب احوال و اشعار حافظ، تألیف مجد زادہ صہبا، چاپ اصفہان ۱۳۲۱ ہجری شمسی)

مجد زادہ صہبا نے اپنے اس مختصر سے غیر ذمہ دار[1] رسالہ میں لکھا ہے کہ اس کے پاس موجود ایک نسخہ میں ۱۳۰ اشعار کا ایک قطعہ آٹھویں صدی ہجری کے ایک مشہور دانشمند قاضی عضد الدین ایجی نے ادبی اور علمی مشکلات کے تحقیق کے سلسلہ میں حافظ کو لکھ کر بھیجا تھا۔ اگر یہ درست مان لیا جائے تو اس سے دولت شاہ سمرقندی کی عبارت یعنی یہ کہ حافظ شاعر سے بڑھ کر دانشمند تھا صحیح معلوم ہوتی ہے۔ بہر حال جس قطعہ کا ذکر مجد زادہ نے کیا ہے، اس کا مطلع یوں ہے:

بہ سمع اشرف فردوسی زمان برسان
کہ ای زر وی تو روشن چراغ دیدۂ خود

حافظ نے بارہا غزلوں میں ایران کے قدیم حکمران خاندانوں، اساطیری اور تاریخی شخصیتوں، زرتشتی مذہبی تہواروں اور تمدنی عنوانوں کا نام لیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ایران کی قدیم تاریخ کا بغور مطالعہ کیا ہوگا۔ یوں تو ہر ایرانی اپنی تاریخ اور تاریخ تمدن کو شوق سے پڑھتا اور اس پر فخر کرتا ہے۔ لیکن ایک عالم اور شاعر کی حیثیت میں حافظ کے لیے تاریخی اطلاعات سے پوری واقفیت رکھنا لازمی تھا۔ اس نے ایران کے قدیم شاعروں کے

و مطالع و مصباح و تحصیل قوانین ادب و تجسّس دواوین عرب بجمع اشتات غزلیات نپرداخت و بتدوین و اثبات ابیات مشغول نشد"

دیوان حافظ کی غزلوں سے بعض اشعار سے گلندام کے قول کی تصدیق ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ دو شعر ملاحظہ ہوں:

کنون کہ بر کف گل جام بادہ صاف است — بصد ہزار زبان بلبلش در اوصاف است

بخواہ دفتر اشعار و راہ صحرا گیر — چہ وقت مدرسہ و بحث کشف کشاف است

گلندام نے جن چار کتابوں کا نام سطور بالا میں لیا ہے، ہم یہاں سرسری طور ان کے بارے میں کچھ بتائیں گے۔

(۱) "کشاف" سے مراد زمخشری کی مشہور تفسیر "الکشاف عن حقائق التنزیل" ہے۔ یہ کتاب پہلے یورپ اور پھر مصر میں چھپی۔

(۲) "مفتاح" سے مراد سکاکی (متوفی ۶۲۶ ہجری) کی "مفتاح العلوم" ہے۔

(۳) "مطالع" سے ... گلندام کا مقصد بظاہر قاضی بیضاوی (متوفی ۶۸۵ھ) کی کتاب "مطالع الانظار فی شرح طوالع الانوار" ہے۔ یا قاضی ارموی (متوفی ۶۸۲ھ) کی "مطالع الانوار" ہے۔ یا عبد الرزاق حنبلی الرسعنی (متوفی ۶۶۱ ہجری) کی "مطالع انوار التنزیل" ہے۔

(۴) "مصباح" نام کی کئی کتابیں ہیں، شاید یہاں المطرزی (متوفی ۶۱۰ھ) کی "مصباح" ہو۔

علامہ قزوینی نے دیوان حافظ کے صفحہ "ق" پر مندرجہ بالا کتابوں کے متعلق معلومات درج کرتے ہوئے لکھا ہے، دیوان حافظ کے بعض قلمی نسخوں میں جو اس کے پاس موجود ہیں، یا جن تک اس کی رسائی تھی، گلندام کے مقدمہ میں لکھا گیا ہے کہ حافظ نے "کشاف" اور "مفتاح" پر حاشیے لکھے ہیں۔ لیکن بعض دیگر نسخوں میں یہ عبارت

ہے۔ (اگرچہ کلند آم ۔۔ نام کے کسی بھی شخص کے وجود سے انکار کرتا ہے) لیکن کہیں بھی یہ نہیں لکھا ہے کہ
مولانا قوام الدین حافظ کے استاد تھے۔ البتہ علی اصغر حکمت کا خیال ہے کہ مولانا قوام الدین عبداللہ فقیہ
حافظ کے اُستاد تھے۔ ریاض العارفین اور دریائے کبیر کے علاوہ چند اور تذکروں میں عبداللہ شیرازی کو
حافظ کا اُستاد بتایا گیا ہے۔

صاحب عرفات العاشقین نے لکھا ہے کہ حافظ ہمیشہ شاہ قوام الدین کے حلقۂ درس میں شریک
ہوتا تھا۔ دقت کے بعد معلوم ہوگا کہ ایسے دو شخصوں کے نام ہم تک پہنچے ہیں جنھیں حافظ کے استاد کے
عنوان سے یاد کیا جاتا ہے۔ یعنی ابو شمس الدین عبداللہ سنجری شیرازی اور قوام الدین ابو اسحاق سنجری
تذکرہ ریاض العارفین میں درج ہے کہ حافظ کے علاوہ شیخ زین الدین علی کلاہ بھی اسی شمس الدین
عبداللہ کا شاگرد تھا۔ علی کلاہ کے بارے میں ہم نے کچھ دلچسپ معلومات حاصل کی ہیں جنھیں اگلے
صفحوں پر درج کیا جائے گا۔

صاحب "لطائف الخیال" نے ایک دلچسپ لیکن غیر قابل اعتماد لطیفہ بیان کیا ہے،
جس سے میر سید شریف نام کے ایک شخص کے سامنے حافظ کے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا اشارہ
ملتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ حضرت خواجہ علیہ الرحمہ بظاہر بڑے پائے کے عالم نہ تھے۔ اس لیے حقائق
معارف سے کیا ایسے پھول اُن کے گلستان میں کھلے ہیں کہ ہوشمندوں کے فکر و اندیشہ کا دماغ انھیں
سونگھنے سے عاجز ہے۔ ان کا علم اعلیٰ درجہ کا نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ حکمت العین میں جہل بسیط کی
بحث میر سید شریف سے پڑھ رہے تھے۔ جب میر نے دیکھا کہ حافظ میں اس بحث کے سمجھنے کی صلاحیت
نہیں تو فرمایا کہ جہل بسیط وہی ہے جو تمھارے اس شعر میں نمودار ہوا ہے:

گفتم این جام جہان بین بتو کی داد حکیم
گفت آن روز کہ این گنبد مینا می کرد

تم نے کیوں نہیں کہا کہ "ایجاد می کرد"۔

اس کے بعد صاحب تذکرہ نے کوہ جبل مقام میں حافظ کے حضرت ساقی کوثر

دیوان بڑے غور سے پڑھے تھے اور ان کی طرف بعض اوقات اشارہ بھی کیا ہے۔ لینن گراڈ کے کتاب خانہ میں شاہنامہ فردوسی کا ایک قلمی نسخہ ہے جس کے آخری صفحہ پر کاتب نے اپنا نام شمس الدین محمد حافظ شیرازی لکھا ہے۔ گمان ہو سکتا ہے کہ یہ حافظ شیرازی کے ہاتھ کا ہو۔

میں سے جن کا اُس نے خاص مطالعہ کیا تھا، وہ یوں ہیں:

فردوسی۔ نظامی۔ خیام۔ مولوی۔ خاقانی اور امیر خسرو۔

اپنے معاصرین کا کلام بھی اُس کے زیر مطالعہ تھا۔ ان میں عماد فقیہ۔ سلمان ساوجی۔ شاہ شجاع۔ ہمام تبریزی۔ شاہ نعمت اللہ ولی اور کمال خجندی کا نام لیا جاتا ہے۔

فارسی کے علاوہ حافظ نے عرب شاعروں کے دیوان بھی پڑھ لیے تھے اور اُن کے محاسن و معائب سے آشنا تھا۔ چنانچہ بہت سے عربی اشعار کو عیناً یا کم و کاست تغیر کے ساتھ اپنی غزلوں میں کھپایا ہے اور ان سے خود گلندام کا یہ دعویٰ کہ خواجہ صاحب نے عرب دواوین میں تجسس کی تھی، ثابت ہوتا ہے۔ اشم رضی نے دیوان حافظ کے آخر میں اُن تمام عربی شعروں یا مصرعوں کو ایک جگہ جمع کیا ہے جو غزلوں میں لائے گئے ہیں۔

۴۔ حافظ کے اُستاد

دیوان حافظ پر محمد گلندام کے مقدمہ میں یوں درج ہے:

"...... و مسود این ورق عفا اللہ عنہ ما سبق در درسگاہ دین پناہ سیدنا استاد البشر قوام الملت والدین عبد اللہ اعلی اللہ درجاتہ فی اعلی علیین بکرات و مرات که بمذاکرہ رفتی رفتی، محاورہ گفتی که این فرائد را ہمہ در یک عقد می باید کشید ..."

پروفیسر براؤن نے اپنی ادبی تاریخ میں یہ عبارت درج کی ہے۔ لیکن اس سے کہیں بھی یہ نتیجہ نہیں نکلتا ہے کہ مولانا قوام الدین حافظ کے اُستاد تھے۔ قاسم غنی و قزوینی نے بھی دیوان حافظ پر محمد گلندام کے مقدمہ ... بڑی کاوش اور صحت معیار کے ساتھ مفید حاشیہ ضبط کیا

الانس" اپنے ساتھ لی. جب مولانا نے یہ کتاب دیکھی اور حافظ کے احوال کا مطالعہ کیا تو اُس کے حاشیہ پر حافظ کا یہ شعر درج کیا ہوا پایا:

حافظ مرید جام جم است ای صبا برو　　وز بندہ بندگی برسان شیخ جام را

اس کے بعد مولانا جامیؒ نے فرمایا کہ حافظ پیر گلرنگ کا مرید اور تربیت یافتہ ہے جو اپنے زمانہ کا بزرگ شخص تھا اور حافظ ہمیشہ اس کی مجلس وعظ میں شریک ہوا کرتا تھا۔

(مقدمہ دیوان حافظ از قاسم غنی صفحہ ۲)

عبیداللہ بیرونی مشہور بہ "افلاطون" نے "حل لاینحل" نام کا ایک رسالہ [illegible] میں لکھا تھا، اس کا ایک نسخہ جس کی کتابت ۱۲۸۲ھ ہجری میں ہوئی ہے. ہاشم رضی کے پاس موجود ہے۔ اس رسالہ میں مؤلف نے لکھا ہے کہ:

"شیراز میں ایک پیر تھا جو صفائی قلب اور نور باطن میں مشہور تھا۔ اس کی جبین پاکیزگی کے نور سے روشن تھی اور اُس کے رخسار گلگون تھے۔ اسی لیے لوگ اسے "پیر گلرنگ" کے نام سے پکارتے تھے۔ جو کوئی اُسے دیکھتا، گویا گلاب کا پھول دیکھتا۔ القصہ حافظ کے اکثر اشعار کے مضامین دراصل اسی پیر کی باتیں ہیں جو حافظ نے اس کی روح پرور مجلس میں سُنی تھیں اور بعد میں انھیں نظم کیا۔ اس نے فضل اور علم کے دیوان سے جو کچھ حافظ کو پسند آیا اپنے دیوان لسان الغیب میں اس کی طرف اشارہ کیا۔"

بہر حال پیر گلرنگ کے وجود کو اس شکل میں مانیں یا نہ مانیں جس شکل میں تذکرہ نویسوں نے اس کو ہمارے سامنے پیش کیا، ایک بات قطعی طور پر پیش کی جا سکتی ہے کہ حافظ مرشد کی تلاش میں تھا اور آخرکار اسے ایک مرد کامل مل بھی گیا، جس کا دامن اس نے نہیں چھوڑا۔ اس ضمن میں دیوان میں کئی شعر موجود ہیں۔ مثلاً:

گذر بر ظلمات است خضر راہی کو　　مباد کآتش محرومی آب ما ببرد

حاصل کرنے کے واقعہ کو بیان کیا ہے۔ سید میر شریف یا سید شریف جرجانی اپنے وقت کے بڑے عالم تھے اور شاہ شجاع کے حکم سے شیراز میں بلوائے گئے۔ "مدرسہ دار الشفا" میں درس دیتے تھے۔

۵۔ پیر گلرنگ

علوم متداولہ حاصل کرنے کے لیے جن اُستادوں کے سامنے حافظ نے زانوے تلمذ تہ کیا ہوگا اُن میں دو کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بھی پتا چلتا ہے کہ حافظ نے علوم درسی کی تکمیل کے بعد اپنے وقت کے ایک بزرگ کی مجلس وعظ و گفتار میں شرکت کی تھی۔ اس بزرگ کا نام پیر گلرنگ بتایا گیا ہے اور اکثر تذکرہ نویسوں نے حافظ کے اس شعر کا حوالہ دیا ہے

پیر گلرنگ من اندر حق ازرق پوشان
رخصت خبث نداد ورنہ حکایت ہا بود

پیر گلرنگ نام کے کسی بزرگ کے تفصیلی حالات ہمیں معلوم نہیں ہو سکے ہیں۔ البتہ محمد دهدار نے جامی کی نفحات الانس میں لکھا ہے کہ شیراز میں گلرنگ نام کے ایک بزرگ تھے، جو اکثر جامع عتیق میں بسر اوقات کرتے تھے۔ حافظ ان کی مجلس صحبت میں بار ہا شامل ہوتا رہا، یہاں تک کہ یہ شہرت ہو کر ان کا مرید ہو گیا ہے۔ اس کے بعد حافظ کا متذکرۂ بالا شعر پیش ہے۔

عبد الحسین بیات کے پاس دولت شاہ سمرقندی کے تذکرہ کا ایک قلمی نسخہ ہے جس کی کتابت ۸۹۳ھ ہجری میں ہوئی تھی۔ یہ نسخہ اسحاق قاجار متخلص بہ صاحب کے پاس بھی رہ چکا ہے اُنھوں نے ۱۲۹۸ ہجری میں خواجہ حافظ کے احوال کے ورق کے حاشیہ پر یہ عجیب عبارت لکھی ہے:

"میں نے دولت شاہ کے ایک تذکرہ میں پڑھا کہ خراسان کا ایک طالب علم تحصیل علم کی غرض سے شیراز چلا گیا تاکہ وہ اپنے زمانے کے مشہور عالم مولانا جلال الدین دوانی کے سامنے زانوے ادب تہ کرے۔ اُس نے نفحات

[illegible]
لکھا کہ حافظ کا کوئی مرشد نہ تھا۔ عارفا نے جو لکھا کہ اگرچہ پیر کے بغیر کوئی آگاہ [illegible] فوکا [illegible]

وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایران کے اکثر شاعروں نے یا تو کسبِ معاش کے لیے یا کسبِ شہرت کی غرض سے دور دراز ملکوں کا سفر اختیار کیا۔ مثلاً صفوی دور میں اس لیے ایران کے کئی چھوٹے اور بڑے شاعر ہندوستان کی طرف چلے آئے کیوں کہ مغلیہ دربار میں ان کی بڑی قدردانی ہوتی تھی۔ علاوہ ازیں ان کی معاشی حالت بدرجہا بہتر ہو جاتی تھی۔ لیکن حافظ کچھ تو قناعت پسندی کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ وطن میں خوش گزران زندگی بسر کرتے تھے، سفر کی طرف مائل نہ ہوئے ہوں گے۔ شیراز کی آب و ہوا اور وہاں کی تہذیبی اور تمدنی دولت حافظ جیسے پُر ذوق شاعر کے لیے مانعِ سفر ہوں گے۔ یہ بات ان اشعار سے معلوم ہوتی ہے جو حافظ نے شیراز کی تعریف میں کہے ہیں یا اس سے پہلے سعدی نے بھی کہے تھے۔ مصلیٰ کی گلگشت اور رکنا باد کا پانی حافظ کو سفر پر جانے کی اجازت نہیں دیتے۔

نمی دہند اجازت مرا بہ سیر و سفر
نسیم باد مصلیٰ و آب رکنا باد

بدہ ساقی می باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلیٰ را

جہاں تک دنیاوی شہرت کا تعلق ہے حافظ ان چند خوش قسمت شاعروں میں شامل ہیں جنھیں اپنی زندگی میں ہی خاصی شہرت نصیب ہو چکی تھی۔ وہ اس نکتہ سے باخبر تھے۔ اس لیے کسی دوسری جگہ جا کر کسبِ شہرت کے لیے سفر کی صعوبتیں اُٹھانا اس بزرگ منش شاعر کے لیے بے معنی تھا۔ ایک اور وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ حافظ کے زمانے میں غالباً شیراز ہی ایک ایسا خطہ تھا جہاں زندگی باقی نواحی کے مقابلے میں پُرسکون اور بے اغتشاش تھی۔ تیمور کی خونریزیوں نے ایران کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی اور اس قدیم تہذیبی اور تمدنی گہوارے کو پاش پاش کرنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑ رکھی تھی۔ ایران طوائف الملوکی کے دور میں دھکیلا گیا اور ہر طرف شورش اور قتل و غارت کا دور دورہ تھا۔

کئی اشعار موجود ہیں۔ مثلاً:

قطع این مرحلہ بی ہمرہی خضر مکن
ظلماتست بترس از خطر گمراہی

پیر دردکش ما گرچہ ندارد زر و زور
خوش عطابخش و خطاپوش خدائی دارد

بندۂ پیر مغانم کہ ز جہلم برہاند
پیر ما ہرچہ کند عین دلالت باشد

اصولِ تصوف کے تحت بھی پیر و مرشد کا ملنا سالک کے لیے لازمی امر ہے۔ البتہ حافظ کا مرشد، جیسے کہ اس کے اشعار سے مستفاد ہوتا ہے، اپنی الگ خصوصیات رکھتا ہے۔ یعنی یہ کہ وہ اپنے وقت کے ظاہر پرستوں اور ریاکاروں کی جماعت سے نہیں، جن کی اس زمانے میں بھرمار تھی۔ اس کا پیر ایسے ریاکاروں کے خلاف ہو کر شراب نوشی اور رندی کو ریا اور زرق پر ترجیح دیتا ہے۔ اس لیے حافظ کسی شاعرانہ جذبے سے اثر میں آ کر نہیں کہتا:

دوش از مسجد سوی میخانہ آمد پیر ما
چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما

پیر گلرنگ کے ساتھ شیخ علی کلاہ کا نام بھی وابستہ ہوتا ہے جس کو حافظ نے "کوتاہ آستین" کہہ کر یاد کیا ہے۔ ہم نے گزشتہ اوراق میں علی کلاہ سے متعلق معلومات درج کی ہیں، اس لیے تکرار سے پرہیز کرتے ہیں۔

۶۔ سیر و سیاحت

دیوان کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ حافظ سیر و سیاحت کی طرف زیادہ مایل نہ تھے، اور ساری عمر شیراز کے خطۂ دل پذیر میں ہی رہ کر گزاری۔ اس کی کئی

حکمران بنا اور اسی کے ساتھ اپنے اقربا کے ساتھ جنگ و جدال میں مصروف رہا۔ البتہ اس کی حکومت کی مدت قلیل ثابت ہوئی۔ غالباً اس وجہ سے بھی حافظ نے اس کی مدح میں کوئی قصیدہ نہیں کہا۔ ایک قطعہ کے اس شعر سے کچھ اشارہ ملتا ہے کہ حافظ نے شاہ یحییٰ کی مدح کی۔ لیکن کوئی قصیدہ ایسا ہماری نظر سے نہیں گزرا جو سرتاپا قصیدہ کی صورت میں اسی بادشاہ کے لیے لکھا گیا ہو۔

شاہ منصور دم ندید و بی سخن صد لطف کرد

شاہ یزد دم دید و مدحش گفتم و ہیچم نداد

البتہ کئی غزلوں میں اکا دکا ایسے اشعار ہیں جن میں شاہ یحییٰ کا نام ملتا ہے۔ بطور مثال مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں۔

گر نکو دی نصرت الدین شاہ یحییٰ الکریم — کار ملک و دین ز نظم و اتفاق افتادہ بود

گوئی برفت حافظ از یاد شاہ یحییٰ — یارب بیادش آور درویش پروریدن

شاہ یحییٰ ادب دوست نہ ہونے کے علاوہ بہت بخیل بھی تھا۔ ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں جس سے یہ اخذ کیا جائے کہ شاہ یحییٰ نے حافظ کو یزد آنے کی دعوت دی ہو۔ سفر کا کیا باعث بنا یہ بھی معلوم نہیں۔ حافظ اس سفر سے خوش نہ تھے اور دیوان میں کئی ایسے اشعار ملتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ یزد کے سفر میں کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے تھے جن سے وہ بہت پریشان رہے۔ مثلاً اس مطلع کی غزل کو دیکھیے:

خرم آن روز کزین منزل ویران بروم — راحت جان طلبم و زپی جانان بروم

اس غزل کے تیور سے معلوم ہوتا ہے کہ وطن سے دور رہ کر لکھی گئی ہے۔ یزد میں اپنی اقامت کو ایک مصیبت اور غم سمجھا ہے۔ اور جس قدر جلد ممکن ہو، وہاں سے شیراز واپس آنا چاہتے ہیں۔ ان اشعار کی اس غزل میں سفر کی تکلیفیں اور وطن واپس آنے کی خواہش کا اظہار ملتا ہے۔

حافظ کو شیراز سے باہر جانے میں کوئی واقعی دل چسپی نہ تھی۔ ان کو شیراز کے صاحب کمال لوگوں پر ناز تھا اور ان کے وجود کو فیض قدسی سمجھتے تھے۔ اپنے ہمعصروں سے جو علم و فضل اور خلوص میں بلند مرتبہ رکھتے تھے، مفرور ہونا حافظ کے لیے قابل برداشت نہ تھا۔ شیراز کی تعریف میں ایک مدحیہ غزل کے ایک شعر سے اس کی تائید ہوتی ہے:

خوشا شیراز و وضع بے مثالش   خداوندا نگہدار از زوالش

بہ شیراز آی و فیض روح قدسی   بجوی از مردم صاحب کمالش

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ سیر و سیاحت کا قطعی شوق نہ تھا، یا یہ کہ واقعی شیراز سے کسی دوسری جگہ تھوڑے وقت کے لیے بھی، نہیں گئے۔ ہمیں دیوان حافظ میں کئی شعر ملتے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ کو زندگی کی کسی منزل پر ضرور سیر و سیاحت کا شوق ہوا تھا:

من کز وطن سفر نگزیدم بہ عمر خویش
در عشق دیدن تو ھواخواہ غربتم

تذکرہ نویسوں نے حافظ کے تین سفروں کی اطلاع دی ہے۔ یعنی سفر اصفہان، سفر یزد اور سفر ہندوستان۔ لیکن ان کی اطلاع نہ تو یکساں ہے اور نہ ہی مستند۔ اکثروں نے تو حافظ کے اشعار ہی سے ان کے سیر و سیاحت کے نتائج کو اخذ کیا ہے۔ بہرصورت ہم ہر ایک سفر دستیاب شدہ اطلاع کو مربوط اور تحقیقی نکتۂ نظر سے پیش کریں گے۔

یزد کا سفر

یہ معلوم نہیں ہے کہ یزد کے سفر کا اتفاق حافظ کو کس سال میں ہوا تھا۔ ہم "عصر حافظ" والے باب میں یزد کی تاریخ کے بارے میں مختصر طور پر چند باتوں کا ذکر کریں گے یہاں اختصار کے ساتھ یہ کہنا کافی ہے کہ نصرت الدین شاہ یحییٰ امیر تیمور کی مدد سے شیراز کا

شاہ یحییٰ کا نام لیے بغیر حافظ نے اس کی سرد مہری کی شکایت ایک قطعہ میں کی ہے۔ ہاشم رضی کے ذریعے چھپے ہوئے دیوان میں یہ قطعہ تو ہے، لیکن قزوینی کے ایڈیشن میں نہیں ہے (۱)

دل مبند ای مرد بخرد بر سخای عمرو زید
کس نمیداند که کارش از کجا خواهد گشاد
رو توکل کن نمیدانی که نوک کلک من
نقش هر صورت که زد رنگی دگر برون فتاد
شاه هرموزم ندید و بی سخن صد لطف کرد
شاه یزدم دید و مدحش گفتم و هیچم نداد
کار شاهان این چنین باشد تو ای حافظ مرنج
داور روزی رساں توفیق و نصرت شاں دهاد

ممکن ہے حافظ نے شاہ یحییٰ سے وظیفہ کی درخواست کی ہو جو نا منظور ہوئی اور تب جاکر دبی زبان میں شکایت کی۔ اس بات کی طرف مندرجہ ذیل اشعار میں اشارہ ملتا ہے:

دارای جهان نصرت دین خسرو کامل
یحیی بن مظفر ملک عالم عادل
ای درگه اسلام پناه تو گشاده
بر روی زمین روزنهٔ جان و در دل

---

(۱) بتایا جاتا ہے کہ جب سلطان ہرمز کو معلوم ہوا کہ یزد کے والی نے حافظ کی مناسب خاطر مدارات نہیں کی ہے تو اس نے کچھ تحفے اور دعوت نامہ بھیجا جس میں یزدیوں کی ناپسندیدہ رفتار کی معذرت مانگی گئی اور ہرمز آنے کی دعوت دی گئی تھی۔ خواجہ حافظ نے زیرِ نظر قطعہ اسی دعوت کے جواب میں لکھ کر بھیجا۔ (دیوان حافظ، ہاشم رضی، صفحہ ۵۰) قاسم غنی اس قول کی تصدیق کرتا ہے۔

خرّم آن روز کزین منزلِ ویران بروم | راحت جان طلبم وزپی جانان بروم
گرچه دانم که بجائی نبرد راه غریب | من ببوی سرآن زلف پریشان بروم
دلم از وحشتِ زندانِ سکندر بگرفت | رخت بربندم وتا ملک سلیمان بروم[1]
چون صبا با تنِ بیمار و دلِ بی طاقت | بهواداری آن سرو خرامان بروم
درره او چو قلم گربسرم باید رفت | بادل زخم کش و دیدهٔ گریان بروم
نذر کردم گر ازین غم بدرآیم روزی | تادرِ میکدہ شادان وغزلخوان بروم
بہواداری او ذره صفت رقص کنان | تا لبِ چشمهٔ خورشیدِ درخشان بروم
تازیان را غم احوال گرانباران نیست | پارسایان مددی تا خوش وآن بروم[2]

ورچو حافظ زبیابان نبرم ره بیرون[3]
همرهِ کوکبهٔ آصفِ دوران بروم

قیاس کیا جاتا ہے کہ مندرجہ ذیل مطلع کی غزل بھی اسی جذبے کے تحت لکھی گئی ہے، کیوں کہ اس میں بھی وہی احساسات کارفرما ہیں جو سابقہ غزل میں ہیں، بخصوص اس کے مقطع میں پھر وزیر توران شاہ کی طرف اشارہ ہوا ہے ؎

گر ازین منزلِ ویران بسوی خانه روم
دگرآن جا که روم عاقل و فرزانه روم

---

(۱) گذشتہ اوراق میں بتایا گیا کہ زندان سکندر یزد کا نام تھا۔ (تاریخ جدید یزد - علی یزدی)

(۲) تازیان سے مراد محلہ تازیان یزد ہے۔ یہ یزد کے ایک محلہ کا نام ہے۔ پارسایان سے مراد شیرازیان۔ ممکن ہے یزد میں حافظ محلہ تازیان میں ہی ٹھہرے ہوں۔ بعض نسخوں میں یہ شعر تحریف ہو کر یوں درج ہوا ہے ؎

تازکان را غم احوال گران باران نیست | سالکا نامددی تا خوش وآسان بروم

(۳) اس شعر میں آصف دوران سے مراد جلال الدین تورانشاہ ہے۔ حافظ کو شاید اسی تورانشاہ نے یزد سے اپنے ساتھ واپس شیراز لایا تھا۔

اصفہان اور وہاں کے مشہور دریا "زندہ رود" کا نام بھی کہیں کہیں شعر میں آیا ہے۔
اس کے علاوہ کچھ ایسے تاریخی واقعات کی طرف بھی اشارے ہیں جو اصفہان سے تعلق رکھتے ہیں۔
ان شواہد کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے، حافظ اصفہان کے سفر پر کبھی نہ کبھی گئے ہوں۔
جہاں تک تذکرہ نویسوں کے قول کا تعلق ہے، وہ اس ضمن میں کوئی تشفی بخش اطلاع دینے
قاصر ہیں۔

عبدالنبی فخرالزمانی نے تذکرہ میخانہ میں صرف یزد کے سفر کا ذکر کیا ہے۔ اس کا
ضبط کیا ہوا متن یہ ہے:

"آوردہ اند کہ آں سرغزل دیوان الیقان از شیراز کم برآمد اند مگر اینکہ
یک نوبت بہ یزد و از یزد باز بشہر مذکور آرام گرفتہ اند۔"

امین الدین احمد رازی صاحب تذکرہ ہفت اقلیم نے ایک شخص بنام قاضی امین الدین
حسن کے حالات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ایک قصہ بیان کیا ہے، جس کا تعلق حافظ
سے ہے۔ امین الدین حسن اصفہان کا قاضی تھا اور شاہ منصور کے زمانے میں اسی عہدہ
پر فائز تھا۔ رازی نے لکھا ہے کہ حافظ کو اس شہر اصفہان میں مستی کی بنا پر گرفتار کیا گیا اور شہر
میں گھمایا گیا۔ جب امین الدین حسن اس واقعہ سے آگاہ ہوا تو فوراً حافظ کے پاس آیا۔ اُن کے
سر سے کلاہ اُتار کر اپنے سر پر رکھی اور حکم دیا کہ اُسے (اپنے آپ کو) شہر میں لے جا کر اسی طرح
گھمائیں جس طرح حافظ کو گھمایا گیا تھا۔ حافظ نے مندرجہ ذیل غزل اس واقعہ کے سلسلہ میں
اور قاضی امین الدین حسن کی مدح میں کہی:

مرا شرطیست با جانان کہ تا جان در بدن دارم
سوا داری کویش را چو جان خویشتن دارم

اس غزل کے مقطع میں یہ شعر آیا ہے:

بر ندی شہرہ شد حافظ میان ہمدمان لیکن — چہ غم دارم کہ در عالم امین الدین حسن دارم

دارای جهان، نصرت دین خسرو کامل — یحییٰ بن مظفر ملک عالم عادل

ای درگہ اسلام پناه تو گشوده — بر روی زمیں روزنۂ جان و در دل

حافظ قلم شاه جہان مقسم رزق است — از بہر معیشت مکن اندیشۂ باطل

حافظ کی مشہور غزل بے شک یزدیوں اور اُن کے سلطان سے مخاطب ہو کر لکھی گئی ہے جس میں اُس نے اپنی کدورت کا اظہار کیا ہے۔ خیال ہے کہ غزل شاہ شجاع کے پاس بھیجی گئی ہو۔ اس کے چند شعر درج ذیل ہیں:

ای فروغ ماہ حسن از روی رخشان شما — آبروی خوبی از چاه زنخدان شما

عزم دیدار تو دارد جان بر لب آمده — بازگردد یا برآید چیست فرمان شما

ای صبا با ساکنان شہر یزد از ما بگوی — روزی ما باد لعل شکر افشان شما

گرچہ دوریم از بساط قرب ہمت دور نیست — بندۂ شاه شمائیم و ثنا خوان شما

ای شہنشاه بلند اختر خدا را ہمتی

تا ببوسم ہمچو گردون خاک ایوان شما

حبیب یغمائی کا خیال ہے کہ شیراز واپس آنے کے بعد حافظ نے وزیر توران شاہ کے گھر میں قیام کیا، کیونکہ قرض خواہوں نے ان کی غیر حاضری میں شہر کے قاضی کے پاس جا کر حافظ کو محکوم کروا دیا تھا۔ ایک قطعہ میں انھوں نے ان حالات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ قطعہ یہ ہے:

بمن سلام فرستاد دوستی امروز — کہ ای نتیجۂ کلک تو سواد بینائی

پس از دو سال کہ بختت بخانہ بازآورد — چرا ز خانۂ خواجہ بدر نمی آئی

اصفہان کا سفر

دیوان حافظ میں کئی غزلیں ملتی ہیں، جن میں اصفہان کے حکمرانوں کا نام لیا گیا ہے

× کای سر حق ناشناسان گوی میدان شما

مرا عہدیست با جانان کہ تا جان در بدن دارم
ہوا داری کویش را بجانِ خویشتن دارم
صفای خلوتِ خاطر ازان شمع چگل جویم
فروغ چشم و نور دل ازان ماہ ختن دارم
بکام آرزوی دل چو دارم خلوتی حاصل
چہ فکر از خبثِ بد گویان میانِ انجمن دارم
مرا در خانہ سروی ہست کاندر سایہ قدش
فراغ از سرو بستانی و شمشادِ چمن دارم
گرم صد لشکر از خوبان بہ قصد دل کمین سازند
بحمد اللہ و المنۃ بتی لشکر شکن دارم
سزد کز خاتم لعلش زنم لاف سلیمانی
چو اسم اعظم باشد چہ باک از اہرمن دارم
الا ای پیرِ فرزانہ مکن عیبم ز میخانہ
کہ من در ترک پیمانہ دلی پیمان شکن دارم
خدا را ای رقیب امشب زمانی دیدہ برہم نہ
کہ من با لعل خاموشش نہانی صد سخن دارم
چو در گلزار اقبالش خرامانم بحمد اللہ
نہ میل لالہ و نسرین نہ برگ نسترن دارم
برندی شہرہ شد حافظ میان ہمدمان لیکن
چہ غم دارم کہ در عالم قوام الدین حسن دارم

دیوان حافظ میں موجود کئی غزلوں سے استنباط کیا جا سکتا ہے کہ حافظ کو اول تو اصفہان کے سفر کی بڑی آرزو تھی اور بعد میں یہ آرزو پوری بھی ہو گئی۔ چنانچہ اصفہان کی آب و ہوا کی خوشگواری اور زندہ رود کی تعریف ایسے لہجے میں ہوئی

امین الدین احمد رازی کی اس کہانی کی تردید بڑمان نے بھی کی ہے اور ہاشم رضی نے بھی۔ انھوں نے تین دلیلوں کی بنا پر قصّہ کو رد کیا ہے۔

اوّل یہ کہ دیوانِ حافظ کے قدیم نسخوں میں اس غزل کے مقطع میں "امین الدین حسن" نہیں بلکہ "قوام الدین حسن" ہے۔ جدید نسخوں میں تحریف کے نتیجہ میں امین الدین حسن لکھا گیا ہے۔

دوم یہ کہ اگر بالفرض امین الدین حسن ہی ہو، تب بھی یہ بات ناقابلِ قبول ہے کہ شریعت کا سب سے بڑا علَم بردار یعنی شہر کا قاضی عوام الناس میں اپنی اتنی بڑی بے عزتی کروانے پر رضامند ہوا ہو کہ اصفہان کے لوگوں سے اپنا مضحکہ اُڑوائے۔

سوم یہ کہ پوری غزل کے تیور سے اس حادثہ کی تصدیق نہیں ہوتی بلکہ برعکس شاعر کی خوش حالی اور داخلی فراغت و سکون کا پتہ چلتا ہے۔ معترضین کے ان تینوں اعتراضوں میں کافی وزن ہے اور ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس بحث سے اگر اصل موضوع کی تائید نہیں ہوتی، تاہم غزلِ مذکور پر غور کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس کے کئی شعروں سے پتہ چلتا ہے کہ "بدگو" اپنی خباثت میں لگے تھے۔ چوں کہ حافظ کا اندازِ بیان رمز و اشارات سے پُر ہے اور اصولاً اس کی غزل ہر لحاظ سے متنوع ہے اس لیے واقعہ کو صاف اور روشن الفاظ میں بیان کرنے میں تامل ہوا ہوگا۔

بہرحال اس موضوع پر بحث کی ضرورت نہیں، کیوں کہ اگر اثبات واقعہ سے یہ مراد ہے کہ حافظ کے سفرِ اصفہان کو تقویت پہنچے، تو ہمارے پاس اس کے علاوہ اور بھی کئی شواہد ہیں جن سے اُن کے اصفہان کے سفر کی تائید ہو سکتی ہے۔ لیکن سردست چوں کہ ہم نے اس غزل کی طرف کچھ دیر تک اپنی توجہ مبذول کی ہے۔ لہٰذا لازم ہے کہ اس کو علّامہ قزوینی کے ایڈیشن سے نقل کر کے درج کیا جائے۔

اگرچہ ما بندگان پادشہیم
پادشاہانِ ملک صبح گہیم

کے مطلع کی غزل میں جس کا اشارہ منصور کی طرف ہے، حافظ نے قرضہ یا مالِ اعانت کی رقم واگزار کرنے کا مطالبہ کیا ہے:

"وام حافظ بگو کہ باز دہند کردہ اعتراف و ما گواہیم"

ہندوستان کا سفر

کئی تذکروں میں حافظ کو ہندوستان آنے کی دعوت کا ذکر آیا ہے۔ اس کی تصدیق یا تردید بڑا مشکل اور اہم کام ہے۔ براؤن نے اس ضمن میں شبلی نعمانی ہی کا حوالہ دیتے ہوئے کچھ واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔ جدید ایرانی محققوں نے اس مسئلہ میں بڑے شکوک پیدا کئے ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ قبل ازیں کہ اسے زیرِ بحث لایا جائے، مناسب ہوگا کہ شعر العجم میں درج شبلی نعمانی کی عبارت کو نقل کیا جائے۔ کیونکہ شبلی کی دی ہوئی تفصیل باقی تمام تذکرہ نویسوں کی تفصیل کی نسبت وسیع تر ہے۔ شبلی فرشتہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

دکن میں سلاطین بہمنیہ کا دور تھا، اور سلطان محمود بہمنی مسندِ حکومت پر متمکن تھا۔ وہ نہایت قابل اور صاحبِ کمال سلطان تھا، عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں نہایت فصاحت کے ساتھ شعر کہہ سکتا تھا۔ عام حکم تھا کہ عرب اور عجم سے جو شاعر آئے اس کو ہر قصیدہ کے بدلے ایک ہزار تنکہ جو ہزار تولہ سونے کے برابر ہوتے تھے انعام میں دیے جائیں۔ اس کی قدر دانی کی شہرت سن کر حافظ کو دکن کے سفر کا شوق دامن گیر ہوا۔ لیکن شوق ہی شوق تھا۔ یہ خبر میر فضل اللہ کو ملی، جو محمود کے دربار میں صدارت کے منصب پر فائز تھا۔ اس نے زادِ راہ بھیج کر طلبی کا خط لکھا۔ حافظ نے اس رقم میں سے

اگر "سلیمیٰ منذ حلت بالعراق"، مطلع کی غزل کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسے اصفہان میں قیام کے دوران ہی لکھا گیا ہے۔ چوتھے شعر سے پتہ چلتا ہے کہ اصفہان کا سفر حافظ نے پختہ عمر میں کیا تھا اور مقطع میں وطن مالوف اور وہاں کے دوستوں کی یاد کے جذبہ کو بیان کیا ہے۔ یہ انداز ان کی اور بھی کئی غزلوں میں ملتا ہے، بلکہ ساقی نامہ بھی ایسے اشارات سے خالی نہیں، بشرطیکہ مانا جائے کہ ساقی نامہ بھی انھیں کی تخلیق ہے۔

اس ضمن میں مندرجہ ذیل اشعار بھی ملاحظہ ہوں:

وصال او ز عمر جاوداں بہ — خداوندا مرا آن دہ کہ آن بہ

بداغ بندگی مُردن برین در — بجان او کہ از ملک جہان بہ

بخلدم دعوت ای زاہد مفرما — کہ این سیب زنخ زان بوستان بہ

اگرچہ زندہ رود آب حیاتست — ولی شیراز ما از اصفہان بہ

اصفہان کے سفر کی شیریں یاد حافظ کے دل میں باقی رہی۔ انھوں نے وہاں کے دوستوں، بزرگوں اور صاحب دلوں کو گرمجوشی سے یاد کیا ہے، انھیں دعائیں دی ہیں اور اُن سے جسمانی دوری پر حسرت و افسوس کا اظہار بھی کیا ہے۔ مندرجہ ذیل غزل کے بارے میں بھی قیاس ہے کہ اصفہان سے واپس آکر اس شہر کی یاد میں لکھی گئی ہے۔ ان کے اور سفر یزد کے بارے میں جو غزلیں اور شعر موجود ہیں اُن کے درمیان لب و لہجہ میں زمین آسمان کا فرق ہے:

روز وصل دوستداران یاد باد — یاد باد آن روزگاران یاد باد

ہمارا قیاس ہے کہ حافظ نے اصفہان کا سفر شاہ منصور کے عہد حکومت میں انجام دیا تھا۔ اس بادشاہ کی مدح میں حافظ نے ایک پُرزور قصیدہ بھی کہا ہے اور اس کی زربخشی [?] اور علم دوستی کی تعریف کی ہے۔ لگتا ہے کہ سفر کے اخراجات برداشت کرنے کے لیے حافظ کو سلطان کی طرف سے مالی امداد بھی ملی ہوگی، چنانچہ

افضل اللہ نے غزل سلطان محمود بہمنی کی خدمت میں عرض کی اور اس سے متعلق سارا ماجرا
بیان کیا۔ سلطان نے دربار کے اہم اور معتمد رکن ملا محمد قاسم مشہدی کو ایک ہزار طلائی
سکہ (ٹنکہ) دیے تاکہ ہندوستان کی عمدہ مصنوعات خرید کر حافظ کو تحفتاً پیش کرے"
شبلی نعمانی نے یہ قصہ تاریخ فرشتہ سے اخذ کیا ہے۔ یہ تاریخ ۱۰۱۵ھ میں لکھی گئی تھی اور آج تک بڑی
مستند مانی جاتی ہے۔ چونکہ یہ تاریخ حافظ کی وفات کے صرف ۲۳ برس بعد لکھی گئی ہے اس لحاظ
سے ممکن ہے کہ قصہ متذکرہ بالا میں کمتر مبالغہ ہو۔ اس کے علاوہ مولوی عبدالمقتدر نے کتابخانہ
بانکی پور میں فارسی کتابوں کی فہرست میں حافظ کی اس غزل کا روئے سخن محمود شاہ
بہمنی کی طرف بتایا جاتا ہے جو ۷۸۰ھ سے لے کر ۷۹۹ھ تک دکن کا سلطان تھا۔ یہ
زمانہ بھی حافظ کے دورِ حیات کے ساتھ آخری سات سال چھوڑ کر مطابقت رکھتا ہے۔ اس
لحاظ سے بھی فرشتہ کی دی ہوئی داستان درست معلوم ہوسکتی ہے۔ لیکن اس کی تردید مندرجہ
ذیل دلائل کی بنا پر ہوسکتی ہے۔

۱۔ محمود شاہ بہمنی کا دورِ سلطنت ۷۸۰ھ سے لے کر ۷۹۹ھ تک تھا۔ حافظ نے ۷۹۲ھ میں
۶۵ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ لہذا جس وقت محمود شاہ بہمنی تخت پر بیٹھا اس وقت حافظ کی عمر گویا
۵۳ برس کی۔ اگر یہ فرض کریں کہ محمود شاہ نے تخت پر بیٹھتے ہی حافظ کو دکن آنے کی دعوت دی
تب بھی ایک سال کا وقفہ ہوا ہی ہوگا اور گویا چپن برس کی عمر میں حافظ کو ہندوستان
آنے کی دعوت ملی ہوگی۔ ہمیں یہ قبول کرتے ہیں تامل ہوتا ہے کہ حافظ جیسا وارستہ
شاعر پیرانہ سری میں ہندوستان جیسے دُور دراز ملک کے سفر کی صعوبتیں اٹھانے پر
آمادہ ہوا ہو، جب کہ اس نے جوانی میں یزد کے سفر کے بعد مصمم ارادہ کیا تھا کہ آیندہ
کسی سفر پر نہ جائے گا۔ وہ سفر کی دشواریوں سے باخبر تھے۔ اور پھر ہندوستان
جیسے ملک کے طویل سفر سے جس کے لیے کم از کم ایک سال تو درکار تھا ہی۔

۲۔ فرشتہ کا قول ہے کہ نازک مزاج شاعر کی ناز برداریاں دو تاجروں
کے ذریعے کب ممکن تھیں۔ یہ بات قابل قبول نہیں۔ جو شخص ایران کے تہذیبی اور
تمدنی ورثہ اور ایرانیوں کی علم دوستی اور ادب پروری سے بخوبی واقف ہیں، انھیں

لکھا ہے کہ:-

دکن میں سلاطین بہمنی کا دور تھا اور سلطان شاہ محمود بہمنی مسند آرا تھا۔ وہ نہایت قابل اور صاحبِ کمال سلطان تھا۔ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں نہایت فصاحت کے ساتھ شعر کہہ سکتا تھا۔ عام حکم تھا کہ عرب اور عجم سے جو شاعر آئے اس کو پہلے قصیدے پر ایک ہزار ٹنکہ جو ہزار تولہ سونے کے برابر ہوتے تھے، انعام میں دیئے جائیں۔ اس کی قدردانیوں کی شہرت سن کر حافظ کو دکن کے سفر کا شوق ہوا مگر ہوا۔ لیکن شوق ہی شوق تھا۔ یہ خبر میر فضل اللہ کو ملی جو محمود کے دربار میں وزارت پر متمکن تھا۔ اس نے زادِ راہ بھیج کر بلایا۔ حافظ نے اس رقم میں کچھ بھانجوں کی ضروریات میں صرف کیا اور کچھ ادائے قرض میں۔ کچھ باقی رہا اس سے زادِ سفر کا سامان مہیا کر کے شیراز سے روانہ ہوا۔ لار نام کی ایک جگہ پر پہنچ کر کسی دیرینہ دوست سے ملاقات ہوئی۔ اس کا مال و اسباب کسی حادثہ میں لٹ چکے تھے۔ حافظ کے پاس جو کچھ تھا اس کو بخش دیا اور آپ خالی ہاتھ رہ گئے۔ اتفاق یہ کہ خواجہ زین الدین ہمدانی اور خواجہ محمد کازرونی دو معروف ایرانی تاجر بھی ہندوستان آرہے تھے۔ انھیں یہ حال معلوم ہوا تو حافظ کے مصارف کے کفیل ہوئے۔ لیکن سوداگروں سے ایک نازک مزاج شاعر کے ناز کب تک اُٹھائے جا سکتے ہیں۔ حافظ کو رنج ہوا تاہم صبر سے کام لیا اور محمود شاہی جہاز پر جو دکن سے ہرمز بندرگاہ پر آیا تھا اور ہندوستان کو واپس جا رہا تھا سوار ہوئے۔ اتفاق یہ کہ جہاز نے لنگر بھی نہ اُٹھایا تھا کہ طوفان بپا ہوا۔ خواجہ صاحب فوراً جہاز سے اُترے اور یہ غزل لکھ کر فضل اللہ کے پاس بھیج دی

دمی با غم بسر بردن جہان یکسر نمی ارزد به می بفروش دلق ما کزیں بہتر نمی ارزد

ساقی حدیث سرو و گل و لالہ می‌رود

حافظ نے اس طرح پر اپنی مشہور و معروف غزل لکھ کر بھیجی :

ساقی حدیث سرو و گل و لالہ می‌رود — وین بحث با ثلاثۂ غسّالہ می‌رود

شبلی نے اس قصّہ کے لیے کسی تذکرے کا حوالہ نہیں دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ براؤن نے اپنے معمول کے مطابق شبلی سے نقل کرتے ہوئے ساری ذمہ داری اُنہی پر ڈالی ہے۔

اس داستان کی تردید میں کئی دلیلیں دی گئی ہیں اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ داستان بے بنیاد ہے۔ معترضین کا کہنا ہے کہ :

(۱) غزل میں سلطان غیاث الدین ممدوح کے طور پر لایا گیا ہے۔ اس بادشاہ کے بارے میں مورخوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ غیاث الدین بن اسکندر ہے جو مغربی بنگال کے شہر "پانڈوا" کا سلطان تھا اور ۷۶۹ھ میں مسند حکومت پر بیٹھا تھا۔ اس کے باپ کی بنائی ہوئی عمارتوں کے آثار ابھی تک باقی ہیں۔

بعض کا کہنا ہے کہ یہ وہی محمود شاہ دکنی ہے جس کا ذکر ہم نے گزشتہ اوراق میں کیا۔ تیسرے خیال کے لوگ یہ کہتے ہیں کہ غیاث الدین پیر علی دراصل کُرت خاندان کا سلطان ہے جو ۷۹۳ھ میں ہرات میں حکمرانی کرتا تھا۔ اُستاد علی اصغر حکمت کا کہنا ہے کہ ان تینوں راویوں میں سب سے پہلی رائے یعنی یہ کہ سلطان غیاث الدین والی بنگال کی طرف اشارہ ہے۔ زیادہ قرین قیاس معلوم پڑتی ہے۔ کیونکہ غزل میں ایک بار بنگالہ لایا گیا ہے۔ یعنی :

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند
زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ می‌رود

---

(۲) کچھ مورخوں کا خیال ہے کہ سلطان غیاث الدین ۷۹۲ ہجری میں تخت نشین ہوا تھا اور یہ حافظ کا سال وفات ہے۔ اس لیے شبلی کے قول کو قبول کرتے ہیں۔

ایک ایسے عظیم شاعر کی نازبرداریوں سے تنگ آئے ہوں، جس کی قربت انھیں نہ صرف شہرت عطا کرتی، بلکہ مالی فوائد کے لحاظ سے بھی سود مند رہتی۔ بالخصوص خواجہ محمود گاؤں کے لیے ایسا رویہ اختیار کرنا قطعی ناممکن سا لگتا ہے، کیونکہ گاؤں کے ساتھ حافظ کے جذباتی تعلقات کا ہونا لازمی تھا۔ جو لوگ ایرانیوں کی وطن پرستی، انسان دوستی اور ہم وطنی کے لطیف جذبات کی سرشاری سے آگاہ ہیں، انھیں فرشتہ کے قول کو قبول کرنے میں بڑی دقت آتی ہے۔ کیا یہ دو تاجر اتنا نہیں سمجھتے تھے کہ حافظ جیسے شاعر کا ہندوستان میں ہونا، خاص کر جب کہ وہ سلطان دکن کی دعوت پر ہندوستان آ رہے تھے، ان کے لیے رسوخ اور احترام فراہم کرنے میں ممد ہو سکتا ہے۔

(۳) جہاز میں اترتے ہی سمندر میں طوفان آیا اور حافظ گھبرا کر الٹے پاؤں چلے آئے، یہ بچوں جیسی بات ہے۔ کیا پچپن برس کے حافظ کو سمندر میں رونما ہونے والے طوفانوں کے خطروں کا پہلے سے اندازہ نہ تھا، جو شخص "شب تاریک و بیم موج و گرداب چنیں حایل" جیسے ہولناک منظر کی تصویر کھینچ سکتا ہے کیا وہ اس بات سے آگاہ نہیں ہوگا کہ ہندوستان کے طویل سمندری سفر کے دوران اسے بہ نفس نفیس ان خطروں سے دوچار ہونا پڑے گا، عقل سلیم قبول نہیں کرتی کہ حافظ اس قدر تنک مزاج آدمی تھے۔

(۴) اگر یہ غزل شاہ محمود کے لیے کہی گئی ہوتی تو اس کا صلہ ضرور حافظ کو ملتا اور لازمی تھا کہ صلے کے شکرانہ میں وہ کوئی قصیدہ یا غزل لکھتے جس میں ملاقات کی طرف اشارہ ہوتا۔ ایسا نہیں ہوا ہے۔ دیوان میں نہ تو اس مقصد کا کوئی قصیدہ ہی ہے اور نہ کوئی غزل۔

شبلی نے لکھا ہے کہ شاہ محمود بہمنی کے علاوہ بنگالہ کے فرمانروا سلطان غیاث الدین نے بھی حافظ کو بنگال آنے کی دعوت دی تھی، اور چونکہ ان کے کلام سے مستفید ہونا چاہتا تھا یہ مصرعہ طرح ان کے پاس بھیجا:

زمانے میں سلاطین جلائری کی قلمرو میں شامل تھا۔ چنانچہ سلطان اویس ایلکانی سے منسوب حافظ کی ایک غزل میں یہ شعر ہے:

غنیمت دان و می خور در گلستان — کہ گل تا ہفتۂ دیگر نباشد

بغداد کا سفر

یہ حکایت بھی سننے میں آئی ہے کہ حافظ نے بغداد کا بھی سفر کیا تھا۔ اگرچہ حافظ نے یقینی طور پر صرف یزد ہی کا سفر کیا تھا اور شیراز کی آب و ہوا سے وہ بہت خوش تھے۔ اس کے باوجود ان کے دیوان میں کچھ ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے بغداد کے سفر کی خواہش ظاہر ہوتی ہے۔

رہ ندیدیم بہ مقصود خود اندر شیراز — خرم آں روز کہ حافظ رہ بغداد کند

حافظ کے زمانے میں جلائری خاندان بغداد اور شمالی مغربی ایران پر حکمران تھا۔ امیر مبارز الدین کی سخت گیری اور تعصب کی وجہ سے شیراز میں حالات ابتر ہو گئے۔ حافظ اس خراب ماحول سے باہر نکلنا چاہتے تھے۔

شیراز یونیورسٹی کے کتاب خانہ میں ایک قلمی نسخہ ہے جو مختلف نگارشات پر مشتمل ہے۔ قاسم بیگ برناک اس کا مولف ہے۔ اس میں درج ہے کہ جب شاہ شجاع نے عباسی خلیفہ کے خطبہ کو عام کیا تو شہر کے کچھ بزرگوں نے مرتضیٰ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے شہر ترک کر کے شاہ شجاع کے مخالفوں کے پاس جا کر پناہ لی۔ حافظ شیرازی بھی شیراز چھوڑ کر بغداد چلے گئے۔ جہاں جلائری خاندان کے سلاطین نے ان پر بڑی عنایات کیں۔ وہ سلطان ساوجی کے ہمراہ شاہ مردان کی زیارت کو گئے اور عتبہ بوسی کے بعد یہ غزل سلطان نے اپنے خط میں لکھ کر دروازے پر آویزاں کی۔

ہر کس کہ ندارد بجہان مہر تو در دل — خاکش بود و طاعت او ضایع باطل

ہوتا ہے۔ پژمان کا خیال ہے کہ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ سلطان غیاث الدین حافظ کو بنگال آنے کی دعوت دی تھی تو یہ اُس کی تخت نشینی سے بہت پہلے ہوگی۔

یہاں ہم اصل موضوع سے ہٹ کر تھوڑی دیر کے لیے زیر نظر غزل کے متعلق چند باتوں کو درج کریں گے۔ اِس غزل کا مطلع یعنی:

ساقی حدیث سرو وگل و لالہ میرود　　　　وین بحث با ثلاثۂ غسالہ میرود

ہمیشہ بحث طلب رہا ہے۔ مولوی عبدالمقتدر نے کتاب خانۂ بانکی پور پٹنہ میں فارسی شعرا کی فہرست میں

اسی سلسلہ میں لکھا ہے کہ سلطان غیاث الدین کی تین کنیزیں تھیں جن کے نام سرو گل اور لالہ تھے۔ شاید وہ سلطان کو عشق کرتی تھیں اور حافظ کے کان تک یہ بات پہنچی تھی۔ اسی وجہ سے اُنھوں نے ...... لیکن علی اصغر حکمت نے لکھا ہے کہ غسالہ شراب کے اُن تین گھونٹوں کو کہتے ہیں جو رات کا خمار اُتارنے کے لیے علی الصبح پیے جاتے ہیں۔

استاد بدیع الزماں فروزانفر نے دیوان شمس تبریز کو تعلیقات اور حواشی سمیت تہران میں چھپایا ہے۔ انھوں نے تعلیقات میں لکھا ہے کہ "ثلاثۂ غسالہ صبح اور دوپہر کے درمیان پی جانے والی شراب ہے۔"

ہاشم رضی نے دیوان حافظ کے صفحہ ۴۹۳ کے حاشیہ پر لکھا ہے کہ "ثلاثۂ غسالہ سہ پیالہ شراب کہ بوقت صبح نوشند و آن شوئندۂ غمہا و شوئندۂ کثافت بدن و مزیل کدورت بشریات اشد۔" یہ معنی دراصل غیاث اللغات سے لیے گئے ہیں، بس اس توضیح کے بعد شبلی کی بتائی ہوئی داستان کی تردید استوارتر ہو جاتی ہے۔

مطلع سے پہلے کے شعر میں "گلستان شاہ تک ...... لائی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کسی معروف جگہ کا نام ہے ...... پنجاب میں گلستان نام کا ایک قصبہ ہے جو حافظ کے

اگر بہ نیزہ گلستانی منظر خوبان — نظر بہ غنچہ دہانی و لالہ رخساریست
گمان مبر کہ مرا بہ ہوای عارض دوست — نظر بہ نقطہ مشکین و خط زنگاریست
کہ چشم اہل نظر بر مجاری تعلیمست — کہ در اناس ابداع حضرت باریست
جفای دوست بغایت رسید و ما تسلیم — کہ انتہای جفا ابتدای بیزاریست
فرو گرفتہ فضا بخش ہوای خانہ دل — چنانکہ مدخل روح اندران بدشواریست

عماد در رہ او جان سپار و شکر گزار
کہ جان سپردن ما در رہ طلبگاریست

گزشتہ اوراق میں ذکر کیا گیا ہے کہ عبید زاکانی، حافظ کا ہمعصر شاعر تھا، اور شیراز کا شہری نہیں بلکہ وہاں تحصیل علم بھی کر چکا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عبید زاکانی کی مشہور مثنوی "موش و گربہ" کا اشارہ عماد الدین ہی کی طرف ہے، چونکہ اس شعر کا گربہ کا نام لیا ہے:

ازقضای فلک یکی گربہ — بود چون اژدہا بکرمانا

بہر صورت ہم نے ان تمام اشارات کا ذکر کیا جو حافظ کے شعر سے تعلق رکھتے ہیں ظاہر ہے کہ کسی ایک اشارہ کو بھی قطعی قبول کرنا اشتباہ سے خالی نہ ہوگا جب تک کہ ضمن میں زیادہ مستند اور واضح دلائل سامنے نہ آجائیں۔

۱۲۔ حاجی قوام الدین

اپنے وقت کے جن لوگوں کی تعریف حافظ نے کی ہے، اُن میں حاجی قوام الدین کا نام سرفہرست آتا ہے۔ حافظ نے ایک قطعہ میں شاہ شیخ ابو اسحاق کے زمانے میں ملک فارس میں پانچ اعلیٰ پایہ کے شخصوں کے نام لیے ہیں، اور اُن میں حاجی قوام الدین بھی شامل ہے۔

حافظ اور جلایری سلطان ادریس شیخ ایلکانی کے درمیان غالباً دوستانہ اور مخلصانہ تعلقات تھے۔ چنانچہ حافظ کی اس مطلع کی غزل سے ہمارے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے۔

خوش خبرگل در زباں خوشتر نباشد   کہ در دستت بجز ساغر نباشد

ممکن ہے سلطان ادریس ایلکانی نے حافظ کو اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی ہو لیکن کچھ نامعلوم وجوہات کی بنا پر یہ سفر امکان پذیر نہ ہو سکا۔ خیال ہے ذیل کی غزل اسی واقعہ سے تعلق رکھتی ہے ؎

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گلبیز است   بہ بانگ چنگ مخور می کہ محتسب تیز است

جلایری خاندان کا دوسرا بادشاہ سلطان احمد ۷۸۴ھ میں تخت نشین ہوا۔ دولتشاہ سمرقندی نے اس سلطان اور حافظ کے درمیان اچھے روابط کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"..... سلطان احمد بادشاہ بغداد را اعتقاد عظیم در حق خواجہ حافظ بودی و چندان کہ حافظ را طلب داشتی و تفقد رعایت کردی۔ حافظ از فارس بجانب بغداد رغبت نکردی و بہ خشک پارہ ای در وطن با حرف قناعت نمودی و از مشہد شہرہای غریب فراغت داشتی و این غزل در مدح سلطان احمد بہ دار السلام بغداد فرستاد۔

احمد اللہ علی معدلۃ السلطانی   احمد ادریس حسن ایلکانی

خان بن خان و شہنشاہ شہنشاہ نژاد   آنکہ می زیبد اگر جان جہانش خوانی

حافظ کے شیراز سے باہر کے سفروں یا دعوتوں کا ذکر تمام ہوا۔ اب ہم ان کے کچھ ہم عصر نامور شخصیتوں کا ذکر کریں گے، جن کے ساتھ ان کے تعلقات کے بارے میں کم یا زیادہ اطلاعات ملتی ہیں۔ اس موضوع پر معمول کی طرح ہماری جانکاری کے ذرائع غیر تسلی بخش ہیں۔ ہمیں صرف ان ناقص اشعار وں کے سہارے کچھ چلنا پڑتا ہے جو تذکروں میں مسخ ہو چکے ہیں۔

دیوان حافظ کا مطالعہ کرتے وقت کئی مشہور شخصیتوں کے نام ہمارے سامنے آتے ہیں، ان میں بعض کا نام صریحاً لیا گیا ہے، اور بعض کا بطور اشارہ۔ ہم سلاطینِ وقت کا ذکر اس ضمن میں یہاں نہیں کریں گے کیونکہ اس کے لیے ہم نے الگ باب مخصوص کیا ہے۔ یہاں صرف ان اشخاص کا ذکر کریں گے، جو کسی نہ کسی بات کے لیے ہمارے موضوع یعنی حافظ کے حالات اور زمانے سے تعلق رکھتے ہوں۔

۱۱۔ شیخ عماد فقیہ (۱) (متوفی ۷۷۳ ہجری)

عماد فقیہ

پروفیسر براؤن نے تاریخ ادبی ایران میں لکھا ہے کہ عماد فقیہ کرمانی کی زیادہ شہرت اس وجہ سے ہوئی ہے کہ اس کو خواجہ حافظ شیرازی کا حریف خیال کیا گیا کیونکہ حافظ نے عماد پر طنز کیا ہے ؎

تذکرہ حبیب السیر

اے کبک خوش خرام کجا میروی بایست

غرہ مشو کہ گربہ عابد نماز کرد

اس کہانی کا آغاز دراصل تذکرہ میخانہ سے ہوا ہے۔ عماد کے حالات درج کرتے ہوئے مؤلف نے کہا ہے کہ عماد کرمان کے علماء میں سب سے برتر تھا۔ اس نے ایک بلی پال رکھی تھی۔ نماز کے وقت بلی بھی اس کے ساتھ سجدہ میں جھک جاتی تھی، شاہ شجاع نے اس کو عماد کی کرامت خیال کیا۔ کیونکہ شاہ شجاع ہمیشہ عماد کا حد سے زیادہ احترام کرتا تھا، حافظ کو اس پر رشک آیا اور اس پس منظر میں ایک غزل کہی جس کا مطلع یہ ہے:

صوفی نہاد دام و سر حقہ باز کرد   بنیاد مکر با فلک حقہ باز کرد

---

(۱) شیخ عماد پر مفصل اطلاعات کے لیے ناظم زادہ کرمانی کا رسالہ ملاحظہ ہو، جو اس نے تہران یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی ڈگری حاصل کرنے کے لیے پیش کیا۔

بہ عہد سلطنت شاہ شیخ ابو اسحاق   بہ پنج شخص عجب ملک فارس بود آباد

نخست پادشہی ہمچو او ولایت بخش   کہ جان خویش بپرورد و داد عیش بداد

دگر مربی اسلام شیخ مجد الدین   کہ قاضیی بہ از و آسمان ندید

دگر بقیہ ابدال شیخ امین الدین   کہ یمن ہمت او کارہای بستہ گشاد

دگر شہنشہ دانش عضد کہ در تصنیف   بنای کار مواقف بنام شاہ نہاد

دگر کریم چو حاجی قوام دریادل   کہ نام نیک ببرد از جہان بہ بخشش و داد

نظیر خویش نہ بگذاشتند و بگذشتند
خدای عزوجل جملہ را بیامرزاد

دیوان حافظ میں پانچ بار صریحاً حاجی قوام کا ذکر اور اس کی مدح میں شعر ملتے ہیں۔ تین بار تو غزلوں میں اُس کی زندگی کے دوران ہی نام لیا گیا ہے اور دو بار اس کی موت کے بعد چونکہ حاجی قوام الدین حسن ۷۵۴ ہجری میں فوت ہوا اس لیے یہ تینوں غزلیں حافظ کی وفات سے کم از کم اڑتیس سال قبل لکھی گئی ہیں۔ غزلوں کے مطلع یوں ہیں:-

۱۔ ساقی بنور بادہ بر افروز جام ما   مطرب بگو کہ کار جہان شد بکام ما

۲۔ عشق بازی و جوانی و شراب لعل فام   مجلس انس و حریف ہمدم و شرب مدام

۳۔ مرا عہدیست با جانان کہ تا جان در بدن دارم
ہواداران کویش را چو جان خویشتن دارم

ان تین غزلوں کے علاوہ حافظ نے حاجی قوام کا ذکر ایک بار تو اس قطعہ میں

---

۱ حسین [illegible] کا قول ہے کہ یہ مصرع قنادی غزنوی کا ہے اور خواجہ حافظ نے اس کی تضمین کی ہے۔

کی طرف ہوا ہے۔ ان تذکروں میں مندرجہ ذیل شامل ہیں جن میں درج کی عبارت کو مختصر طور پر بیان کیا جائے گا۔

۱- عرفات العاشقین : تالیف تقی بن معین الدین اوحدی
"........ دلنشین بہ شیخ علی کلاہ نسبت کردہ اند"

۲- ریاض العارفین : تالیف رضا قلی خان ہدایت
"...... علی شیرازی - وھو شیخ زین العابدین کلاہ از مشاہیر عرفا و ظرفا - چون دستک سیاہ بر کلاہ میگویند و شیخ دستار سیاہ رنگ می بستہ ویا این لقب ملقب شدہ با خواجہ شمس الدین محمد شیرازی در خدمت شمس الدین سید اللہ شیرازی تحصیل می نمودند۔

لیکن شیخ علی کلاہ کی طرف حافظ کے اشارے کے بارے میں سب سے زیادہ معنی خیز اطلاع ہمیں تذکرہ دولت شاہ سمرقندی کے ایک نسخہ کے حاشیہ پر مندرج عبارت سے ملتی ہے۔ یہ نسخہ اس وقت عبدالحسین بیات کے ذاتی کتاب خانہ میں موجود رہے ہیں۔

ایک شخص بنام اسحٰق تاجار متخلص بہ صابر نے ۱۱۹۵ ہجری میں اس نسخہ میں حافظ کے شرح احوال کے اوراق کے حاشیہ پر مندرجہ ذیل عبارت لکھی ہے :-

"میں نے دولت شاہ سمرقندی کے تذکرہ کے ایک نسخہ پر لکھا ہوا دیکھا کہ خراسان کا ایک طالب علم کسب علم کے لیے شیراز میں مولانا جلال الدین دوانی کی خدمت میں گیا۔ وہ جامی کی نفحات الانس ساتھ لایا تھا۔ جب یہ کتاب مولانا کی نظر سے گزری اور اس نے حافظ کے شرح حال کے اوراق کا مطالعہ کیا تو ایک شعر ملا جو حافظ سے منسوب کیا جا چکا تھا۔"

عام لوگوں کا خیال ہے کہ حافظ اور عماد کے درمیان شکر رنجی اس لیے بھی ہوئی ہوگی کیونکہ عماد شاہ شجاع کو حافظ کے بارے میں بدظن کرنا چاہتا تھا۔ اس قصہ کو قبول کرتے وقت چند باتوں کو مدنظر رکھنا پڑے گا۔

مجدزادہ صہبا نے "سخنی چند دربارۂ حافظ" میں شاہ شجاع کی عماد سے ارادت کی دو وجہیں بتائی ہیں جن میں کوئی وجہ ایسی نہیں جو عماد اور حافظ کے درمیان شکر رنجی کا باعث بنتی۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ شاہ شجاع کی ماں خان قتلغ مخدوم شاہ کرمان کے قراختائی سلطان قطب الدین کی بیٹی تھی اور عماد کے ساتھ بڑی ارادت رکھتی تھی۔

دوسری یہ کہ عماد کے مرید اکثر آل مظفر کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے رہتے تھے۔ اس لیے شاہ شجاع اُن کو قابو میں رکھنے کی غرض سے عماد کا اثر و رسوخ حاصل کرنے پر مجبور تھا۔ لہٰذا عماد کے ساتھ اس کی دوستی دراصل سیاسی اغراض کی بنیاد پر تھی۔

کئی محققوں کی رائے ہے کہ "گربۂ عابد" والی داستان کی کوئی اصلیت اور بنیاد نہیں۔ حافظ کا اشارہ کلیدِ در گنجِ شاہی میں مندرج "کبک و گربہ" کی مشہور حکایت کی طرف ہے۔ حافظ عماد کے ساتھ نہ صرف کوئی چشمک نہیں رکھتا تھا بلکہ ان کے درمیان دوستانہ اور مخلصانہ تعلقات برقرار تھے۔ اتنا ہی نہیں وہ ایک دوسرے کی غزلوں سے استقبال[1] بھی کرتے تھے۔ اس رائے کا اظہار سب سے پہلے ابن یوسف شیرازی نے کیا ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں داستان کو غلط اور بے بنیاد قرار دیا ہے۔[2]

کئی تذکروں میں اس قصے سے متعلق اشارہ ایک شخص بنام شیخ علی کلاہ (کلاہ دار)

---

(۱) فہرست کتاب خانۂ مجلس شورای ملی، ایران جلد ۲، صفحہ ۲۱۰ تا ۲۲۳۔ مزید معلومات کے لیے ملاحظہ ہو کلیدِ در گنجِ شاہی، تعلیم امتہ، مجلہ تعلیم و تربیت، چاپ پنجم، ص ۱۰۸، ۱۹۳۸ء، دانشمندان ... مقدمہ تصحیح و تحشیہ و تعلیقات ... حصہ دوم صفحہ ۴۴

شیخ علی کلاہ نے ایک بلی پال رکھی تھی۔ جب کبھی شیخ سربسجدہ ہوتا تو بلی اس کے
ساتھ اپنا سر جھکاتی چنانچہ حافظ نے اس پر تعریض کی ہے ؎

ای کبک خوش خرام کجا میروی بناز
غرّہ مشو کہ گربۂ عابد نماز کرد

شیخ علی کلاہ مرد فاضل اور اہل سلوک میں سے تھا۔ علوم غریبہ پر
مہارت رکھنے کے علاوہ صاحب تسخیر بھی تھا۔ اس سے بڑے عجیب اور غریب
صادر ہو سکتے تھے اس لیے اپنے زمانے میں مذاق زمانہ کے باعث مشہور ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا
ہے کہ حافظ کے زمانے میں بزرگان دین اور پیشوایان اہل یقین ہونا کس قدر مشکل تھا:
شیخ علی کلاہ کے بارے میں عرفات العاشقین میں تفصیل سے ذکر آیا ہے جس کو
یہاں اختصار سے نقل کیا جائے گا:

"شیخ علی کلاہ شیرازی از مشائخ صاحب سجادہ۔ کامل واقف۔ عارف
جامع بہ اکثر علوم و رسوم رسیدہ و در مراتب اسماء و تسخیرات یگانہ و فرید
منفرد ملی بدین آمدہ و وفات و مرقدش در شیراز است۔ گویند تا زمان شاہ
شجاع باقی بودہ و میان وی و خواجہ شمس الدین محمد حافظ مباحثات و مکالمات
شدہ الحق وی از جملہ واصلان و مرشدان صاحب قدرت بودہ۔ امور
عجیبہ و غریبہ ازو نقل نمودہ اند۔ و در تذکرۃ المشائخ مسمّٰی بہ مقالۃ الابرار مذکور
است کہ قطب الاولیا الاصفیا واقف دو رکار صمدیت۔ عارف بارگاہ احدیت۔
سالک آگاہ، مجذوب اللہ۔ زین الحق والدین علی بن محمد کلاہ در تحصیل علوم
دینیہ و یقینیہ از طلبہ متردین وارث علوم حقیقی۔ المتخلص بہ لطائف اللہ ابو محمد
شمس الحق و الدین عبداللہ شیرازی بودہ و ارادت تمام بخدمت وی داشتہ و
این رباعی در شأن وی گفتہ:

حافظ مرید جام جم است ای صبا برو
وز بندہ بندگی برسان شیخ جام را

اس کے بعد مولانا جلال الدین دوانی نے فرمایا کہ حافظ پیر گلرنگ[1] کا مرید اور تربیت یافتہ ہے۔ یہ پیر اپنے زمانے کا شیخ الشیوخ تھا اور حافظ ہمیشہ اس کی مجلسوں میں حاضر ہو کر اس کے کلام سے مستفیض ہوا کرتا اس زمانے میں شیراز میں شیخ علی کلاہ نام کا ایک سجادہ نشین بزرگ مسند ارشاد پر متمکن تھا۔ وہ نیلے رنگ کا جبہ پہنتا تھا، جس کی آستین کوتاہ ہوا کرتی تھی[2] پیر گلرنگ اور اس شیخ علی کلاہ کے درمیان قدرے چشمک رہا کرتی تھی۔ حافظ نے اپنے اشعار میں شیخ علی کلاہ پر بڑی تعریض کی ہے:

ے پیر گلرنگ من اندر حق ازرق پوشان ۔۔۔ رخصت خبث نداد ورنہ حکایتہا بود

ے صوفی نہاد دام و سر حقہ باز کرد ۔۔۔ بنیاد مکر با فلک حقہ باز کرد

ے بازی چرخ بشکندش بیضہ در کلاہ ۔۔۔ زیرا کہ عرض شعبدہ با اہل راز کرد

---

(۱) پیر گلرنگ کے بارے میں گزشتہ اوراق میں چند باتیں بیان کی جا چکی ہیں۔ مفصل اطلاع کے لیے ملاحظہ ہو "بہارستان سخن" تالیف میر عبدالرزاق خوافی۔ چاپ مدراس۔ تہران صفحہ ۳۲۶

(۲) کوتاہ آستین کی ترکیب حافظ کے کئی اشعار میں ملتی ہے۔ اگر عرفات العاشقین کی حکایت درست مانی جائے تو ذیل کے دو اشعار سے اس کی مزید تائید ہو سکتی ہے:

ے صوفی پیالہ پیما حافظ قرابہ پرداز ۔۔۔ اے کوتہ آستیناں تا کی دراز دستی

ے بزیر دلق ملمع کمندہا دارند ۔۔۔ دراز دستی کوتاہ آستیناں بین

قرابہ دار

ہوتی ہے:

من این بدعت نمی آرم در اسلام　　　کہ چون رہبان مدام در کوہساران
دو منزل در جہانم اختیار است　　　میان باغ و طرف جوئباران

بدیہی ہے کہ ایسے آزاد طبیعت اور وارستہ شخص کو کیا پڑی تھی کہ شاہ شجاع کو حافظ کے خلاف اکساتا اور اپنے لیے زحمت کا سامان مہیا کرتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اُن کے درمیان مخلصانہ تعلقات ہو سکتے تھے، اور ایک دوسرے کی غزلوں پر غزلیں کہتے تھے بطور مثال ایسے ہی کچھ مطلع ملاحظہ ہوں:

عماد	حافظ	
بیا و کلبۂ ما را شبی منور کن	ز در در آ و شبستان ما منور کن	(۱)
میان مجلس ما ہمچو شمع سر بر کن	ہوای مجلس روحانیان معطر کن	
بگذشت یار و بر من مسکین نظر نکرد	رو بر رہش نہادم و بر من گذر نکرد	(۲)
و اندیشہ ز آب دیدہ و آہ سحر نکرد	صد لطف چشم داشتم و یک نظر نکرد	
ای پیک آشنا خبر آن صنم بگو	ای پیک راستان خبر یار ما بگو	(۳)
با این گدا حکایت آن محتشم بگو	احوال گل بہ بلبل دستان سرا بگو	
مشکین خط او لطف و خطابی نفرستاد	دیریست کہ دلدار پیامی نفرستاد	(۴)
صد نامہ نوشتیم و جوابی نفرستاد	ننوشت کلامی و سلامی نفرستاد	
اگر آن طایر فرخندہ لقا باز آید	ز آن طایر قدسی ندہم باز آید	

باشمس صدی راہ خدا پیمودم — تحصیل علوم نزد او بنمودم
تہذیب صفات نفس امارہ خویش — از خلق جناب مولوی فرمودم"

شیخ علی کلاہ کے علاوہ ایک اور شخص کا سراغ ملتا ہے جس کی طرف حافظ کے زیر نظر شعر کا اشارہ ملتا ہے اور وہ مولانا عبداللہ قوام شیرازی ہے۔ حاج میرزا حسن فسائی نے اپنی تاریخ یعنی "فارس نامہ ناصری" کی دوسری جلد کے صفحہ ۱۳۰ پر مولانا عبداللہ قوام الدین شیرازی کا حال درج کرتے ہوئے کہا ہے کہ شیراز کا یہ عالم و زاہد اپنے وقت کا یگانہ شخص تھا شاہ شجاع کو اس سے بڑی عقیدت تھی بلکہ وہ اس کا ارادتمند تھا۔ حضرت مولانا نے ایک بلی پال رکھی تھی جو نماز کے وقت اس کے ساتھ سربسجدہ ہو جاتی۔ حافظ نے غالباً ایک غزل اسی لیے لکھی۔ یعنی :-

صوفی نہاد دام و سر حقہ باز کرد — بنیاد مکر با فلک حقہ باز کرد

البتہ صاحب فارس نامہ کا بیان سقم سے خالی نہیں۔ وہ یہ کہ اول تو کئی تذکرہ نویسوں نے یہ لکھا ہے کہ حافظ ہمیشہ مولانا عبداللہ قوام الدین (یا قوام الدین عبداللہ) کے حلقہ درس میں شامل ہوتے تھے۔ اور دوم یہ کہ دیوان حافظ کے مقدمہ نویس محمد گلندام نے لکھا ہے کہ عبداللہ قوام الدین حافظ کا استاد تھا۔ ان بیانات کے پیش نظر یہ بات قبول کرنے میں تامل ہوتا ہے کہ حافظ نے یہ ہجو غزل اپنے ہی استاد کے تعرض میں لکھی ہو، اگر یہ بھی مان لیں، کچھ وقت کے بعد ان کے تعلقات اچھے نہ رہے۔ حالانکہ ایسی صورت حال کی طرف کہیں بھی اشارہ نہیں ملتا۔

یہ امر مسلم ہے کہ عماد الدین گوشہ گیر و منزوی تھا۔ وہ عارف باعتقاد و صلاح دنیا سے بالاتر ہو کر خانقاہ ان مظفری کے ساتھ مخلصانہ روابط رکھتا تھا۔

ابن یوسف بھی اسی خیال کی تائید کرتا ہے کہ عماد بڑا عابد تھا وہ کشکول اور تبرزین اور خانقاہ تک سے بے نیاز تھا۔ اس کی تائید تو خود اس کے اپنا شعر سے

کیا ہے جو ہم نے اوپر درج کیا ہے اور دوسری بار حاجی قوام کی تاریخ وفات کا درج ذیل قطعہ ہے:

سرور اہل عمایم شمع جمع انجمن — صاحب صاحبقران خواجہ قوام الدین حسن

سادس ماہ ربیع الآخر اندر نیمروز — روز آدینہ بحکم کردگار ذوالمنن

ہفصد و پنجاہ و چار از ہجرت خیر البشر — مہر را جوزا مکان و ماہ را خوشہ وطن

مرغ روحش کو ہمای آشیان قدس بود

شد سوی باغ بہشت از دام این دار محن

علاوہ ازیں ایک اور قطعہ ہے جس میں حافظ نے اگرچہ صراحت سے حاجی قوام الدین کا نام نہیں لیا ہے۔ لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسی سے متعلق ہونا چاہیئے۔

قطعہ یہ ہے:

ساقی بیا دیر کن زانکہ صاحب مجلست — آرزو می بخشد و اسرار میدارد نگاہ

جنت نقدست اینجا عیش و عشرت تازہ کن — زانکہ در جنت خدا بر بندہ ننویسد گناہ

دوستداران دوست کامند و حریفان با ادب — پیشکاران نیکنام و صف نشینان نیک خواہ

ساز چنگ آہنگ عشرت صحن مجلس جای رقص — خال جانان دانہ دل زلف ساقی دام راہ

دور ازین بہتر نباشد ساقیا راحت گزین

حال ازین خوشتر نباشد حافظا ساغر بخواہ

اس غزل میں حاجی قوام الدین کی طرف اشارے کا مفروضہ اس دلیل پر ہے کہ اس قطعہ میں اور اس غزل میں جس کا مطلع یہ ہے

"عشق بازی و جوانی و شراب لعل فام"

اور جس میں حاجی قوام کا نام صراحت سے لیا گیا ہے، مضمون اور محیط میں بڑی شباہت اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

به پیرانه سرم

عمر برگشته به پیرانه سرم باز آید   جان علوی به تن سفلی باز آید

ذیل میں ہم دونوں شاعروں کی ایک ہی زمین میں بڑی رواں اور شیوا غزل درج کرتے ہیں، تاکہ یہ پتہ چلے کہ معنوی لحاظ سے بھی شیخ عماد اعلیٰ پایہ کا تھا۔ اس کی شخصیت کے معنوی پہلو کو سمجھنے میں شاید اس مقابلے سے مدد ملے۔

دوست
طرہ
ز
وزد
در آن زمین که نسیمی

حافظ

جنان بلبل اگر با منت سر یاریست   که ما دو عاشق زاریم و کار ما زاریست

در آن زمین که نسیمی وزد ز طرهٔ دوست   چه جای دم زدن نافه‌های تاتاریست

بیار باده که رنگین کنیم جامهٔ زرق   که مست جام غروریم و نام هشیاریست

خیال زلف تو پختن نه کار خامان است   که زیر سلسله رفتن طریق عیاریست

لطیفه‌ایست نهانی که عشق از و خیزد   که نام آن نه لب لعل و خط زنگاریست

جمال شخص نه چشم است و زلف و عارض و خال   هزار نکته درین کار و بار دلداریست

قلندران حقیقت به نیم جو نخرند   قبای اطلس آنکس که از هنر عاریست

از هنر عاریست

بر آستان تو مشکل توان رسید آری   عروج بر فلک سروری بدشواریست

سحر کرشمهٔ وصلت بخواب میدیدم   زهی مراتب خوابی که به ز بیداریست

دلش بناله میازار و ختم کن حافظ
که رستگاری جاوید در کم آزاریست

عماد

اُمید بلبل زگل در وفاداریست   ولی وفا نکند شاهدی که بازاریست

بیاد عارض و زلفش نشسته‌ام همه شب   که رند روشن عشاق در شب تاریست

بجان خریده‌ام او را و این نمیدانم   که این معامله در خواب یا به بیداریست

بہار حشمت و خورشید رفعت | گل باغ مکارم عنصر جود
مدار دولت و کان مروت | سپہر مہر سایہ گستر جود
ہمای دولت آثارش چو سیمرغ | بگسترده بگیتی شہپر جود
قوام دولت و دین شیخ اقبال | محیط بحر کف و گوہر جود

صاحب اعظم اکرم دستور اعدل اکرم والی خطہ الجود و الکرم افتخار زوار البیت والحرم اولی البریۃ بمکارالاخلاق و الشیم الفایز بعنایۃ اللہ باو کرامت واوفی نعم ......"

یورپ میں شاہنامہ فردوسی کا ایک نسخہ جو ایک شخص بنام مسٹر ایچ ۔ نیور (H. NEVER) کی ملکیت ہے. علامہ قزوینی کی نظر سے گزرا ہے. یہ ماہ رمضان ۷۴۱ھ میں اسی حاجی قوام الدین حسن کے لیے لکھا گیا تھا. نسخہ کے آخر میں مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:

"تمام شد کتاب شاہنامہ فردوسی بہ فرخی و فیروزی علی ید اضعف عباد اللہ واحوجہم حسن بن محمد بن علی حسینی مشتہر بموصلی اصلح اللہ عاقبتہ فی یوم الاثنین عشرین ذی قعدہ سنہ احدی واربعین وسبعمایہ والہجریہ"

حاجی قوام کی علم دوستی، ادب نوازی اور علو مرتبت کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ زرکوبی نے شیرازنامہ کو اسی کے نام سے معنون کیا ہے. اسی حاجی قوام کے احفاد میں ایران کا ایک نامور فیلسوف محمد ابراہیم بن یحییٰ گزرا ہے جس کو ایرانی تاریخ، فلسفہ و ادب کے عالم ملا صدرالدین زمی کے نام سے جانتے ہیں. ملا صدرا شیخ بہائی، میر داماد اور میر فندرسکی جیسے عظیم فیلسوفوں کا شاگرد تھا. اس کی سو سے بھی زیادہ تالیفات ہیں جن میں کوئی بھی ایک اس کی عظمت اور اس کے مقام کو ذہن نشین کروانے کے لیے کافی ہے. اس کے شاگردوں میں ملا محسن، فیض کاشانی اور ملا عبدالرزاق لاہیجی شامل ہیں. تحصیل علم کے بعد ملا صدرا شیراز واپس آیا اور "مدرسۂ خان" میں درس دیتا رہا.

اس مدرسہ کے بڑے دروازے کے سامنے ایک کمرہ تھا جس میں وہ

حاجی قوام الدین کا ذکر تذکروں میں آیا ہے، ان کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ نے از روے مبالغہ یا از روئے حقیقت اس کی تعریف میں کہا ہے:

دریای اخضر فلک و کشتی ہلال هستند غرق نعمت حاجی قوام ما

شیخ قوام شیراز کے ایک قدیم اور بزرگ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ وہ اپنی ذاتی قابلیت کی بنا پر امیر شیخ شاہ ابو اسحاق کا وزیر بنا۔ وہ ابو اسحاق شاہ کے خاندان کا دوست اور خاص دوست تھا بلکہ اسحاق کے شیراز پر حملہ اور اپنی سلطنت کو وہاں محکم بناتے میں اس کا بڑا ہاتھ تھا علاوہ ازیں شیراز کے لوگوں میں اس کا بڑا رسوخ تھا۔ وہاں کی خوشحالی اور ترقی پر بطور خاص توجہ دیتا تھا، اور اپنی داد و دہش کی بنا پر شیراز کے عوام میں مقبول ہوا تھا۔ یہاں کی حکومت کے سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ چنانچہ روضۃ الصفا میں درج ہے کہ مظفریوں نے جب شیراز کا محاصرہ کیا تو شاہ شیخ ابو اسحاق نے کہا:

'مآل کار من با محمد مظفری چیست ؟'

حاجی قوام نے جواب دیا:۔

"تا من زندہ باشم باکی نداشتہ باش"

حاجی قوام کا ذکر محمود گیتی نے تاریخ خاندان آل مظفر میں بھی کیا ہے۔ لیکن اس کی شخصیت پر پوری روشنی ندکوبی نے "شیراز نامہ" کے مقدمہ میں ڈالی ہے۔ جو اس مقدمہ کی متعلقہ عبارت بڑی دلچسپ ہے اس لیے ہم یہاں بعینہ نقل کرتے ہیں:

"...... بی حمایتی اہل زمان در حق ہنرمندان رئیس ازینکہ صاحب ہمتی دہنروری از ابنای فارس نیابم کہ کتاب خود را باو تقدیم کنم ناگہان خرد خردہ بین کہ فارس میدان فراست است نقش کعبتین اندیشہ از لوح متفکر برخواندہ ...۔"

جبین در آستان صفدر ملک جبین بر آستان صفدر جود

قصہ کے دوران آتا ہے۔ تذکرۂ "حبیب السیر" کے مؤلف خوآند میر نے مولانا جامی کی "نفحات الانس" کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ایک دن شاہ شجاع نے حافظ کی غزلوں پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ آپ کی کوئی غزل مطلع سے مقطع تک ایک ہی نہج پر نہیں ہوتی، چند بیت شراب کی تعریف میں، چند تصوّف میں اور ایک دو معشوق کی توصیف میں ہوتے ہیں۔

حافظ نے جواب میں کہا کہ آپ کا فرمانا بجا، لیکن اس نقص کے باوجود میرے اشعار اطراف آفاق میں شہرت حاصل کر چکے ہیں، جب کہ حریفوں کی غزلیں اور نظمیں دروازۂ شیراز سے باہر نہیں پہنچتیں۔

اس کنایہ سے شاہ شجاع چراغ پا ہو گیا اور حافظ کو اذیت پہنچانے کی غرض سے اس کی ایک غزل کے اس بیت پر شدید اعتراض کیا:

گر مسلمانی از آنست کہ حافظ دارد
وای اگر پس امروز بود فردائی

اور کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ قیامت کے دن مُردوں کے اٹھ کھڑا ہونے کے قائل نہیں۔ بعض حاسدوں نے یہاں تک ٹھان لی کہ ایک فتویٰ جاری کریں کہ روزِ جزا پر شک کرنا کفر ہے، اور حافظ کے اس بیت سے روزِ جزا کے بارے میں شک کی بو آتی ہے۔

حافظ سخت مضطرب ہوئے اور مولانا زین الدین تائیبادی سے جو ان دنوں عازم حج تھے اور شیراز میں قیام پذیر تھے، جا ملے، سب کیفیت بیان کی اور حل کی راہ چاہی۔ مولانا نے فرمایا کہ مقطع سے پہلے ایک بیت لگا دو کہ فلاں شخص یوں کہہ رہا تھا یعنی "نقل کفر، کفر نہ باشد" اس طرح تہمت سے بچ سکتے ہو۔ اس مشورہ کو نظر میں رکھتے ہوئے حافظ نے مقطع سے پہلے یہ شعر بڑھایا:

درس دیا کرتا تھا۔ ۱۳۴۷ ہجری شمسی میں اس کمرہ کی جگہ ایران کی وزارت تعلیم کی نگرانی میں ایک بڑا ہال تعمیر کیا گیا جس کا نام "تالار ملا صدرا" رکھا گیا۔

ملا صدرا سات بار پیدل حج بیت اللہ شریف کو جا چکا تھا اور ۱۰۵۰ھ میں ساتویں حج کے دوران بصرہ میں فوت ہوا اور وہیں دفن ہوا۔ ملا صدرا پر مزید اطلاع مجھے تہران یونیورسٹی میں کسب علم کے دوران فلسفہ کے استاد ڈاکٹر سید نصر کے درس میں ملتی رہی جس کو ضبط کر چکا ہوں اور فرصت ملنے پر اس کو شائع کیا جائے گا۔

ملا صدرا

علمائے شیراز کا ذکر کرتے ہوئے صاحب "فارس نامہ ناصری" نے ملا صدرا کے بارے میں لکھا ہے:۔

"مولانا صدرالدین محمد معروف بہ صدرالمتالہین مشہور بہ آخوند ملا صدرا خلف الصدق مولانا ابراہیم قوامی و شیرازی و حضرت سید علی خان قدس سرہٗ در کتاب سلافۃ العصر فرمودہ است مولانا صدرالدین محمد بن شیرازی مشہور بہ ملا صدرا در بصرہ زمان توجہ او برای حج در عشر خامس از ماہ حادی عشر وفات یافت و جناب ملا صدرا را قوامی برآن گویند کہ گویا از سلالۂ وزیر بی نظیر حاجی قوام الدین حسن شیرازی بودہ کہ خواجہ حافظ علیہ الرحمہ فرمودہ است:

دریای اخضر فلک و کشتی ہلال ، مستغرق نعمت حاجی قوام

۱۳۔ شیخ زین الدین ابوبکر تایبادی

تائب

تایب آباد خراسان کے ایک قصبہ کا نام ہے اور شیخ ابوبکر تایبادی اسی قصبہ کا رہنے والا تھا۔ حافظ کی زندگی کا مطالعہ کرتے وقت اس شخص کا نام ایک دلچسپ

حافظ ابرو نے "جغرافیائی تاریخ" میں امیر تیمور اور مولانا زین الدین تائیبادی کے درمیان ملاقات کے دلچسپ واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے، جس کو ہم اختصار کے ساتھ درج کریں گے۔

"...... اول ذی الحجہ ۷۸۲ ہجری میں تیمور "کوسویہ" کے قصبہ میں آپہنچا اور وہاں سے تائیباد کا رخ کیا جو مولانا زین الدین تائیبادی کا مسکن تھا۔ خواص میں سے کسی نے مولانا کے پاس ازطریق ادب آدمی بھیجا کہ امیر تیمور آپ سے ملاقات کی خواہش رکھتا ہے۔ مولانا نے جواب میں کہلوایا کہ میرا امیر تیمور کے ساتھ کوئی کام نہیں۔ مولانا کا یہ جواب سن کر امیر تیمور خود مولانا کے حجرے کی طرف چلا آیا۔"

حافظ ابرو نے آگے چل کر لکھا ہے کہ امیر تیمور نے مجھ سے کہا:

"مجھے جب سے حکومت اور سرداری ملی ہے تب سے زاہدوں، عابدوں اور گوشہ نشینوں کے ساتھ ملاقات میں مجھ پر اُن کا رعب اور ہراس طاری ہو جاتا ہے۔ البتہ مولانا زین الدین تائیبادی سے مل کر مجھے کوئی ایسا احساس نہیں ہوا۔ وہ حق گو آدمی ہے اور لوگوں سے کنارہ کر چکا ہے۔ ملاقات کے وقت اُس نے کئی اچھی نصیحتیں کیں۔ وعظ کے دوران میں (امیر تیمور) نے اُس سے پوچھا کہ آپ اپنے بادشاہ ملک محمود کو کیوں نصیحت نہیں کرتے، شراب پیتا ہے اور لہو و لعب میں مشغول رہتا ہے۔ مولانا نے کہا میں نے اُسے سمجھایا تھا، مانتا نہیں۔ خدا تعالیٰ نے آپ کو بھیجا کہ آپ اس کی تنبیہہ و تادیب کریں، آپ کو نصیحت کرتا ہوں، اگر آپ نہ مانیں تو خدا تعالیٰ کسی دوسرے کو بھیجے گا، جو آپ کی تنبیہہ و تادیب کرے گا۔"

امیر تیمور یہ نصیحتیں سن کر حیران و ششدر رہ گیا اور مولانا کو وداع کر کے

این حدیثم چه خوش آمد که سحر گہ می گفت

بر در مے کدہ با دف و نی ترسائی

اس حکمت عملی سے حافظ پریشانیوں سے بچ گئے۔

اصل موضوع سے ذرا ہٹ کر ہم یہاں درج کرنا چاہتے ہیں کہ بقول استاد علی اصغر حکمت ان کے پاس مولانا جلال الدین دوانی (متوفی ۹۰۸ ہجری) کے رسالوں کا ایک مجموعہ ہے جن میں اہم چار رسالے ہیں حافظ کی درج ذیل غزل کی تشریح کی گئی ہے، لیکن دیوان حافظ میں یہ غزل موجود نہیں۔

خوشتر از کوی خرابات نباشد جائی	گر بہ پیرانہ سرم دست دہد مأوائی
بہ چہ کن گوش کہ در دہر چو من شیدائی نیست	نیست این جز سخن بوالہوسی عنائی
باادب باش کہ ہر کس نتواند گفتن	سخن پیر مگر برہمنی دانائی

رحم کن بر دل مجروح خراب حافظ

زانکہ ہست از پی امروز یقین فردائی

"نفحات الانس" اور "حبیب السیر" کے علاوہ "عرفات العاشقین" میں بھی یہ قصہ درج ہوا ہے اور شرف الدین علی یزدی اور حافظ ابرو دونوں نے مولانا ابوبکر تائبادی کا ذکر اور تیمور کے شرح حال کے دوران کیا ہے۔ اس سے ہمیں مولانا مذکور کے علم و دانش، اور ان کی بزرگی کے بارے میں قابل اعتبار اطلاع ملتی ہے۔ بلکہ اس داستان کو قبول کرنے میں دلچسپی لیتے ہوئے علی یزدی لکھتا ہے:

"...... و صاحبقران دین پرور پاک اعتقاد بہ عزم زیارت مولانا اعظم اورع زین الدین بہ تائبادی کہ از علمای متورع آں روزگار بود بہ تائباد نزول فرمود بہ صفائی نیت و خلوص طویت صحبت آں یگانہ روزگار دریافت"

(ظفر نامہ جلد اول صفحہ ۳۱۲)

ہیں آیا ہے اور اُس کے ساتھ حافظ کا یہ شعر یاد کیا جاتا ہے:

اگر آں ترکِ شیرازی بدست آرد دلِ ما را

بخالِ ہندویش بخشم سمرقند و بخارا را

گزشتہ اوراق میں اس طرح کے کچھ قصوں کو درج کیا گیا ہے۔ یہ حکایتیں، داستانیں اور افسانے غلط ہوں یا صحیح، بادی النظر میں کسی ضرورت کو پورا نہیں کرتے لیکن اختصار نے تو کیا کوئی بھی چیز اپنے محیطِ زمان اور اوضاع سے الگ کر کے دیکھی جائے تو اس کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ چوں کہ ہم حافظ کے بارے میں کسی بھی واقعہ کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتے۔ ظاہر ہے ہم ان قصوں کی تحلیل و تحقیق نہ صرف باعث دلچسپی خیال کریں گے، بلکہ ہر حال میں ہم ان کو اہم سمجھیں گے۔ خواجہ حافظ کے بارے میں جتنی بھی داستانیں مشہور یا غیر مشہور ہیں اُن کی پڑتال کرنا اور ان کی درستی پر بحث کرنا ہمارا پسندیدہ کام ہے۔

بہر کیف شہر مذکور کے ساتھ تعلق رکھنے والے قصہ کو "تذکرۃ الشعرا" تالیف دولت شاہ سمرقندی، "لطائف الطوائف" تالیف فخر الدین علی صفی، "روضۃ الصفا" تالیف میر خواند اور حبیب السیر تالیف خواند میر میں خفیف اختلاف کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔

دولت شاہ سمرقندی نے لکھا ہے کہ ۷۹۵ہجری میں تیمور نے شیراز کو فتح کر کے شاہ منصور کا خاتمہ کیا اور پھر حافظ کو بلا کر پوچھا کہ میں نے ہزاروں شہروں کو ویران کیا تاکہ اپنی زاد گاہ اور اپنے وطن سمرقند اور بخارا کو آباد کروں۔ تم ایک خالِ سیاہ کے عوض انھیں بخش دو گے(۱)۔

---

(۱) پروفیسر براؤن نے لکھا ہے کہ اُس نے ایران میں اپنے قیام کے دوران سنا کہ حافظ نے تیمور کو بتایا تھا کہ اصل شعر میں تحریف کی گئی ہے جو یوں تھا۔ اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دلِ ما را بخالِ ہندویش بخشم سمرقند و بخارا۔ علی اصغر حکمت نے اس ضمن میں کہا ہے کہ یہ بڑی عامیانہ روایت ہے۔ اور ممکن ہے کہ کسی نے مزاح کے طور پر براؤن کو مصرع بدل کر سنایا ہو۔ چنانچہ شیراز میں ایسی کوئی حکایت مشہور نہیں۔ (حاشیہ سعدی تا جامی)

ہرات کی طرف چلا گیا(۱)

حسین پژمان نے دیوان حافظ کے مقدمہ میں بھی اس واقعہ کا ذکر کیا ہے اور حاشیہ پر اضافہ کیا ہے کہ شیخ زین الدین ابو بکر تائیبادی ھراتی نظام الدین ھروی کا شاگرد تھا اسی کے وجود با برکات کی بناء پر قصبہ تائیباد تیمور کی خونریزی سے بچ گیا۔ اس کی اور حافظ کی وفات ایک ہی سال یعنی ۷۹۱ھ میں ہوئی جیسا کہ اس مصرع سے معلوم ہوتا ہے:

تاریخ وفات قلب او تاد　　　یک نقطہ بنہ بآخر صاد

خواند میر نے "حبیب السیر" میں اس ضمن میں ایک جگہ لکھا ہے کہ مولانا زین الدین سے ملاقات کے دوران جب اس بزرگ نے تیمور سے کہا کہ اگر تم بھی نصیحت نہ مانو گے تو خدا تعالیٰ کسی دوسرے شخص کو تم پر غالب کرے گا۔

تیمور نے پوچھا، وہ کون ہوگا جو مجھ پر غالب آئے گا؟

مولانا نے فرمایا "عزرائیل"

یہ سن کر تیمور خوش ہوا کہ انسانوں میں سے اس پر کوئی غالب نہیں ہو سکتا۔ مولانا کی بات کو فال نیک سمجھا۔

ملک عماد الدین زوزنی نے مولانا زین الدین کی تاریخ وفات میں ایک قطعہ تاریخ کہا ہے جس سے ۷۹۱ ہجری حاصل ہوتا ہے۔ مولانا مذکور یوسف آباد میں جو تربت جام سے چند میل کی دوری پر واقع ہے، دفن ہوئے۔ تیمور کے بیٹے شاہرخ نے ان کے مزار پر ایک وسیع ایوان بنوایا تھا۔

۱۴۔ امیر تیمور

خواجہ حافظ شیرازی اور امیر تیمور کی شیراز میں ملاقات کا ذکر کئی تذکروں

(۱) "جغرافیائی تاریخی" ساقیہ حافظ ابرو۔ قلمی نسخہ آقای مدرس رضوی تہران صفحہ ۲۰۹ جلد دوم

"...... در زمان نزول رایات سلطان جهانیان و پادشاه جهانبان امیر تیمور گورکان و ایام انقلاب دولت سلطان زین العابدین بر اهلِ شیراز امانی مقرر کردند و چون حافظ شاعر یکی از ارباب تأهل بود و خانه داشت از محله او از آنجمله مقداری بنام او نوشتند به محصل حواله کردند در اثناءِ این حالِ بدپناه به امیر مذکور بردو اظہار افلاس و بی چیزی نمود۔ امیر مشارالیه فرمودند تو گفته ای:

اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل ما را
بخالِ هندویش بخشم سمرقند و بخارا را

کسی که سمرقند و بخارا را به یک خال بخشد مفلس نباشد"، حافظ گفت ازین بخشندگیها مفلسم، پس آنحضرت به سبب این جواب بر بدیهه، آن وجه را راجع فرمود و مشارالیه خلاص گشت"۔

اس مختصر سی داستان سے ایک دو باتیں واضح ہوجاتی ہیں:

اول یہ کہ تیمور نے شیراز فتح کرنے کے بعد شہر کے لوگوں پر ٹیکس لگایا تھا۔ ٹیکس ادا کرنے والوں کی فہرست میں حافظ کا نام بھی شامل تھا۔

دوم یہ کہ حافظ متاہل تھے، اور ان کا اپنا مکان شیراز کے کسی محلہ میں تھا۔

سوم یہ کہ غالباً یہ ٹیکس ان ہی لوگوں پر عاید کیا گیا تھا جو ادا کرنے کی استعداد رکھتے تھے۔ استعداد ادائیگی کے لیے متاہل اور خانہ دار ہونا، شرطیں تھیں "...چون... ...داشت" والی عبارت سے ایسا ہی مستفاد ہے۔

لطیفہ کے لیے تیسری قابلِ اعتبار سند "لطایف الطوایف" ہے جسے فخرالدین علی صفی نے ۹۳۰ھ میں شاہ محمد سلطان کے لیے لکھا تھا۔ اس کتاب کے نویں باب میں مؤلف نے سید زین الدین جنابذی کے ذریعہ حافظ کی دربار تیموری میں رسائی اور

حافظ نے کورنش بجا لاکر کہا:

"بادشاہ سلامت! انہی بخششوں کا نتیجہ ہے کہ اس حال میں پڑا ہوں"

تیمور کو یہ لطیفہ پسند آیا اور حافظ پر عنایت اور نوازش کی۔

دولت شاہ نے یہ قصہ ۷۹۵ھ کا بتایا ہے اور آگے چل کر حافظ کا سال وفات ۷۹۴ھ درج کیا ہے۔ پروفیسر براؤن نے اس غلطی کی بنا پر حافظ اور تیمور کے درمیان ملاقات کی صحت کو شک و تردید کی نگاہوں سے دیکھا ہے۔ لیکن دراصل شک اس بات پر نہیں کہ یہ ملاقات رونما ہوئی تھی یا نہیں۔ شک یہ ہے کہ ملاقات نہ تو ۷۹۴ھ میں رونما ہوئی اور نہ ۷۹۵ھ میں۔ امیر تیمور کے دوسرے حملے یعنی ۷۹۵ھ میں ہی شاہ منصور قتل ہوا اور شیراز میں آل مظفر کا خاتمہ ہوا۔ چونکہ حافظ کی وفات ۷۹۱ھ یا ۷۹۲ھ میں واقع ہوئی تھی اس لیے یہ امر بدیہی ہے کہ اگر امیر تیمور اور حافظ کی ملاقات ہوئی بھی ہو تو ۷۸۹ھ میں ہوئی ہوگی۔ اس نتیجہ کی تصدیق تذکرۃ الشعراء سے بہت پہلے ایک رسالہ "انیس الناس" تالیف سنجابی شیرازی میں مندرج عبارت سے ہوتی ہے۔ یہ رسالہ ۸۳۰ھ میں مؤلف مغیث الدین ابوالفتح ابراہیم سلطان شاہرخ سلطان بن امیر تیمور کے لیے لکھا تھا۔

ہاشم رضی نے سنجابی شیرازی لکھا ہے۔ لیکن ڈاکٹر قاسم غنی نے شجاع شیرازی لکھا ہے، اس نے آگے چل کر کہا ہے کہ یہ شخص شاہ شیخ جو اسحاق کے خاندان سے تھا ضمناً یہ بھی بتایا ہے کہ کسی شخص نے اس [illegible] رسالہ کے قلمی نسخہ کو فروخت کرنے کی غرض سے کتابخانہ ملی تہران میں پیش کیا۔ مامورین نے اسے ملاحظہ کے لیے علامہ قزوینی کے پاس بھیجا اس نے اس کے مطالعہ کے دوران حافظ سے متعلق زیر نظر حکایت کو بطور یادداشت نقل کیا جس کو عیناً درج کیا جاتا ہے چوں کہ یہ عبارت دولت شاہ سمرقندی کے بیان سے کچھ اختلاف رکھتی ہے اس لیے اسے یہاں نقل کرنا مناسب خیال کیا جاتا ہے۔

۸۰۔ خواجہ احمد طوسی کو ھرات کا حکمران مقرر کیا گیا۔ وہاں کے لوگوں کے ساتھ بداخلاقی پر افسوس کرتے ہوئے سید زین الدین نے تبریز سے ایک خط خواجہ احمد کے نام بھیجا جس میں حافظ کا یہ شعر درج تھا۔

چشمت بہ عشوہ خانۂ مردم خراب کرد

مخموریت مباد کہ خوش مست میروی

تیمور مظفری خاندان اور حافظ کے تسلشانہ روابط کے بارے میں ہم اس کتاب کی اگلی فصل میں کچھ اور ذکر کریں گے۔

سلاطین اور وزراء کو چھوڑ کر دیوانِ حافظ میں خواجگانِ شیراز میں سے کچھ اور شخصوں کے نام نظر آتے ہیں۔ مثلاً شاہ نعمت اللہ، شاہ داعی، خواجہ عماد الدین محمود، اور کمال الدین ابوالوفا۔ اول الذکر کے بارے میں بیشتر اطلاع شاہ شجاع اور حافظ کے درمیان روابط پر بحث کے دوران زیرِ نظر لائی جائے گی۔ لیکن قوام الدین ابوالوفا کے بارے میں صرف ایک شعر کا حوالہ دیا جا سکتا ہے، جو یوں ہے ؎

وفا از خواجگانِ شہر با من

کمالِ ملّت و دین بوالوفا کرد

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ حافظ کی اس مطلع کی غزل کا اشارہ دراصل شاہ نعمت اللہ ولی کی طرف ہے۔

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند

آیا بود کہ گوشۂ چشمی بما کنند

اور شاہ نعمت اللہ نے کہا ہے:

ما خاکِ راہ را بنظر کیمیا کنیم

صد درد را بگوشۂ چشمی دوا کنیم

۱۵۔ **انتقال**۔ حافظ کے سالِ وفات کے بارے میں تذکرہ نویسوں کے درمیان ایک سال کا فرق

پھر لطیفہ کے واقع ہونے کی داستان درج کی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ دولت شاہ سمرقندی نے اسی کتاب سے اصل حکایت نقل کی ہو۔ کیوں کہ دونوں میں بڑی مطابقت دکھائی دیتی ہے۔

بہرکیف ان تمام شواہد کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ حافظ اور تیمور کے درمیان ملاقات رونما ہوئی ہوگی اور لطیفہ زیر بحث بھی معرض وجود میں آیا ہوگا۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ امیر تیمور فارسی سمجھنے کے علاوہ فارسی بول بھی سکتا تھا چنانچہ ابن عربشاہ نے اپنی کتاب "عجائب المقدور" میں بتایا ہے کہ تیمور فارسی زبان اچھی طرح جانتا تھا قصص الانبیاء اور سیر الملوک سے بڑی رغبت رکھتا تھا۔ سفر اور حضر میں تاریخ اس کے سامنے پڑھی جاتی تھی، جو فارسی زبان ہی میں ہوا کرتی تھی۔ عرب شاہ کی عین عبارت یوں ہے:

"..... وکان امیاً لا یقرا شیأً ولا یکتب ولا یعرف شیأً من عربیۃ ویعرف من اللغات الفارسیہ والترکیہ والمغولیۃ"

قبل ازیں کہ حافظ کے شعر سے متعلق ہم اپنی اطلاعات ختم کریں ایک اور نکتہ کی طرف توجہ دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ گمان ہے کہ "ترک شیرازی" سے حافظ کا اشارہ شاہ شجاع کے بیٹے زین العابدین کی طرف ہو۔ ممکن ہے کہ تیمور اس کنایہ کو بھانپ گیا ہو، تب ہی تو حافظ کو بلا کر بازپرس کی ہوگی۔ اس صورت میں لطایف الطوایف کی متعلقہ عبارت کو تقویت ملتی ہے۔ یعنی یہ کہ سید زین الدین جنابذی کی وساطت سے حافظ تیمور کے سامنے پیش ہوئے۔ سید ایک تیمور کے خاص مقربوں میں سے تھے۔ کیونکہ "مجمل فصیحی" میں سال ۷۸۰ ہجری کے حوادث کے ذکر میں درج ہے کہ تیمور نے دیوان حضرت اعلیٰ کا منصب سید زین الدین جنابذی کو دیا تھا، اور دوسری طرف حافظ کے ساتھ اُس کے روابط دوستانہ اور مخلصانہ تھے۔ اس لیے ممکن ہے اس نے بیچ بچاؤ کیا ہو۔ حافظ اور سید مذکور کے باہمی اخلاص کا پتہ "مجمل فصیحی" کی ایک اور حکایت سے چلتا ہے۔

(۵) تقی کاشی نے "خلاصۃ الاشعار و زبدۃ الافکار" میں ۷۹۱ھ ضبط کیا ہے۔[1]
(نسخہ خطی۔ کتاب خانہ مجلس شوریٰ ملی)

(۶) دیوان حافظ کے بعض نسخوں کے مقدمہ میں جو محمد گلندام سے منسوب کیا جاتا ہے، حافظ کے انتقال کے بارے میں یہ عبارت درج پائی جاتی ہے۔

"...... تاریخ احدی و تسعین و سیتہا ودیعت بیمات بموکلان قضا و قدر سپرد"

موخر الذکر سال وفات یعنی ۷۹۲ ہجری کو ضبط اور قبول کرنے کے لیے یہ شواہد ہیں:-

(۱) فصیحی خوافی نے "مجمل فصیحی" میں ۷۹۲ ہجری کے دوران رونما شدہ وقائع کے تحت حافظ کے انتقال کا واقعہ بھی درج کیا ہے اس کی عبارت یوں ہے:

"...... اثنین و تسعین و سبعمائۃ ۷۹۲۔ وفات مولانا اعظم افتخار الافاضل شمس الملۃ والدین محمد الحافظ شیرازی بہ شیراز مدفوناً بہ کت[1]"

و در تاریخ او گفتہ اند:

بسال ب و ص و ذ ابجد — ز روز ہجرت میمون احمد
بسوی جنت اعلی روان شد — فرید عصر شمس الدین محمد

فصیحی خواجہ حافظ کی وفات کے وقت پندرہ سولہ برس کا نوجوان تھا اور اس لحاظ سے حافظ کے زمانہ نے کے بہت قریب تھا۔

---

(۱) کت بمعنی شہر ملاحظہ ہو "محیط و احوال و اشعار رودکی" از استاد سعید نفیسی صفحہ ۱۵

+ کت یا کنت یا کند یا قند اسم خاص ہے جو پسوند کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً سمرقند۔ عربی میں "قط" کی صورت میں آیا ہے مثلاً مسقط

پڑتا ہے۔ یعنی بعض نے ۷۹۱ ہجری ضبط کیا ہے اور بعض نے ۷۹۲ھ۔ اول الذکر قول کے لیے مندرجہ ذیل اسناد ہیں۔

(۱) اکثر دیوان حافظ کے نسخوں (چاہے قلمی ہوں یا چاپی) کے آخر میں مادۂ تاریخ وفات میں مندرجہ ذیل بے اساس قطعہ درج ہوا ہے

چراغ اہل معنی خواجہ حافظ — کہ شمعی بود از نور تجلّی

چو در خاک مصلّی یافت منزل — بجو تاریخش از خاک مصلّی

یہ قطعہ حافظ کے سنگ مزار پر کندہ کرایا گیا ہے اور "خاک مصلّی" کی ترکیب مادۂ تاریخ کے لیے زبان زد عام ہو گئی۔

(۲) مسٹر ھرمن بکنل (HERMAN BICKNELL) نے "حافظ شیراز" (HFIAZ OF SHIRAZ) کے عنوان سے اپنی کتاب میں متذکرہ بالا مادۂ تاریخ کو انگریزی زبان کے ایک مصرع میں بطور ابجد ضبط کیا ہے۔

THRICE TAKE THOO FROM MOSALLAS EARTH

ITS RICHEST GRAINS

کلمہ: MOSALLAS FARTH کے لاطینی ہندسوں یعنی M+L+L کا مجموعہ ۱۱۰۰ اور کلمہ ITS RICHEST GRAINS کے لاطینی ہندسوں سے ۱۰۳ نکلتا ہے۔ اور جب ایک سو تین کو تین بار گیارہ سو سے نکالیں تو باقی ۷۹۱ رہ جاتا ہے۔

(۳) لطف علی بیگ آذر نے آتش کدۂ آذر میں تاریخ وفات ۷۹۱ ہجری بتائی ہے۔

(۴) رضا قلی خان ھدایت نے "ریاض العارفین" اور "مجمع الفصحا" میں ۷۸۱ھ بتایا ہے۔

پر معلوم ہوتا ہے کہ مصلیٰ سے حافظ کی محبت اور گلگشت وغیرہ اور آخر کار مصلیٰ میں ہی اس کی آرام گاہ کی مناسبت سے بھی اس قطعہ کے گمنام شاعر نے "خاک مصلیٰ"[1] کو مادہ تاریخ بنایا اور ایک سال کے فرق کو نظر انداز کر دیا۔ البتہ ایسا کرنے والا اپنے مقصد میں بے شک کامیاب ہوا۔ کیونکہ "خاک مصلیٰ" ہی خاص و عام کی زبان پر چڑھا ہوا ہے۔

حافظ کا انتقال یقینی طور پر شیراز میں ہوا تھا اور آرام گاہ حافظ کے بارے میں ہم نے پہلے باب میں پوری تفصیل درج کی ہے جس کا اعادہ کرنا غیر ضروری ہے البتہ اس ضمن میں تحقیق کے بعد ایک اور دلچسپ موضوع ہمارے سامنے آتا ہے جس پر حسب پر چند سطریں درج کرنے کی گنجائش ہو سکتی ہے۔

دیوان حافظ کے مقدمہ جو کو محمد گلندام سے نسبت دی جاتی ہے مقدمہ نویس نے خواجہ حافظ کے القاب من منجملہ دیگر صفات و مشخصات "المرحوم الشہید" بھی لکھا ہے۔ متعلقہ عبارت یہ ہے:

"...... ذات ملک صفات مولانا الاعظم السعید المرحوم الشہید مفخر العلماء استاذ نحاریر الادبا۔ معاد اللطائف الروحانیہ محمد الحافظ شیرازی بود"[2]

علامہ قزوینی نے کہا ہے کہ اس کے پاس موجود یا زیر نظر گیارہ قلمی نسخوں میں سے سات میں یہ عبارت دیکھی گئی۔ تذکرہ نویسوں نے غالباً اسی محمد گلندام کے مقدمہ کی عبارت کو نقل کیا ہے اور ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ آیا اس مقدمہ کے علاوہ کوئی اور ماخذ

---

(۱) اس مقولہ کی تمام تر ذمہ داری علامہ محمد قزوینی اور ڈاکٹر غنی پر عاید ہو گی۔ انہی دو نسخوں کو سامنے رکھ کر حافظ کا مستند نسخہ تیار کیا تھا۔

(۲) دیوان حافظ مرتبہ قزوینی و غنی صفحہ ق حاشیہ

(۲) جامی نے نفحات الانس میں حافظ کی وفات کو بڑی صراحت اور بغیر کسی نقل قول کے "اثنین وتسعین وسبعمائة (۷۹۲) درج کیا ہے. جامی. حافظ کی وفات کے صرف پچیس سال بعد ۸۱۷ ہجری میں متولد ہوا تھا. وہ بھی حافظ کا قریب العصر تھا.

(۳) خواندمیر نے بھی "حبیب السیر" میں صریحاً اور بغیر کسی نقل قول کے ۷۹۲ھ بتایا ہے.

(۴) قاضی نوراللہ شوشتری نے "مجالس المومنین" میں ۷۹۲ھ درج کیا ہے.

(۵) ملا سودی نے دیوان حافظ کی ترکی زبان میں اپنی مشہور شرح میں سال وفات ۷۹۲ھ بتایا ہے.

(۶) حاجی خلیفہ نے "کشف الظنون" میں ۷۹۲ھ درج کیا ہے.

(۷) دیوان حافظ کے دو مستند ترین اور قدیم ترین قلمی نسخوں[۵۱] (یعنی رشید یاسمی اور ملک) میں محمد گلندام سے منسوب مقدمہ میں "خاک مصلیٰ" والا مادہ تاریخ کا قطعہ شامل نہیں. برعکس ان میں واضح طور "اثنی وتسعین وسبعمائة (۷۹۲) اور پھر تاریخ وفات میں وہ قطعہ درج ہے جو مجمل فصیحی میں آیا ہے. مقدمہ کی عبارت یوں ہے:

"...تا در تاریخ سنۂ اثنی وتسعین وسبعمائة ودیعت حیات بموکلان قضا وقدر سپرد و رخت وجود از دہلیز تنگ اجل بیرون برد و روح پاکش با ساکنان عالم علوی قرین شد و ہمخوابہ پاکیزہ رویان حورالعین گشت ....."

ان تمام شواہد کے پیش نظر ۷۹۲ ہجری کو ہی حافظ کا سالِ وفات خیال کرنا چاہیے. خاک مصلیٰ والے مادہ تاریخ کی بے بنیادی پر کوئی شک نہیں بلکہ واضح طور

---

[۵۱] اس مقولہ کی تمام تر ذمہ داری علامہ محمد قزوینی اور ڈاکٹر غنی پر عائد ہوگی۔ انہی دو نسخوں کو خاص کر سامنے رکھ کر انھوں نے حافظ کا مستند نسخہ تیار کیا تھا۔

کہنا کہ "ورآن ایام بجوار ایزدی پیوست" چھ سال کی مدت کے لیے استعمال نہیں ہو سکتا ہے۔ لہذا یا تو داستان سراسر غلط ہے، یا یہ کہ تنبیہ کرنے والا یا چوب زنی کرنے والا شاہ شجاع نہیں بلکہ کوئی دوسرا سلطان تھا۔ چنانچہ فرصت نے شاہ شجاع کا نام لیے بغیر "بعض سلاطین" لکھا ہے۔ ممکن ہے صاحب عرفات کا بیان درست ہو لیکن ہمیں یہ بھی معلوم ہو کہ شاہ شجاع کے علاوہ کسی بھی دوسرے سلطان نے حافظ کے اشعار پر نکتہ چینی نہیں کی اور نہ ہی انھیں اس کی تنبیہ یا چوب زنی کا بہانہ بنایا۔ تذکرہ نویس متفق ہیں کہ خواجہ حافظ کے انتقال کے بعد بادشاہ کو تاسف ہوا اور اس نے حکم دیا کہ جہاں بھی کہیں حافظ کا شعر ملے اس کو پیش کیا جائے حوالے کرنے والوں کو انعام ملے گا۔ صاحب عرفات نے "گر مسلمانی از آنست کہ حافظ دارد" والے شعر کے متعلق جنجال اور زین الدین ابو بکر تایبادی کے ذریعہ خلاصی کی داستان کے بعد لکھا ہے "لیکن در اثنای این قضیہ عورات وی جمیع مسودات را پارہ پارہ کردہ بشستند تا مبادا مغرقی از آنہا بوی سد، بلی دوستان ناقصان را اثر از ین بہتر نباشد خواجہ بعد از ین واقعہ بسیار متاثر و متالم گردیدہ دہمان ایام بجوار ایزدی پیوست۔ بعد از خواجہ معاندین از کردہ خود شرمسار گردیدہ بودند۔ کوچک و بزرگ طلاب اشعار فرمودند۔ از جملہ آن پادشاہ امر فرمود کہ ہر کہ غزلی از خواجہ بیاورد و یک اشرفی و دو بیت دیناری بہ جائزہ بیابد۔ بہ این تقریب شعر وی ہر جا کہ منتشر گردید بر زبانہا افتاد و شہرتش بجای رسید چون مردم بہ جستجوی اشعار در آمدند از ہر کس نیز شعر بسیاری بنام وی مشہور شد"

مثالیں دیتے ہوئے صاحب عرفات لکھتا ہے کہ یہ دو غزلیں دراصل بہاء الدین زنگانی کی ہیں لیکن انھیں حافظ سے منسوب کیا گیا (۱)

(۱) ساقیا مایۂ شباب بہار

(۲) دل من در ھوای روی فرخ

اس مقولہ کی تصدیق دریای کبیر کے علاوہ اور بھی کئی تذکروں سے ہوتی ہے۔ بشرطیکہ

---

(۱) عرفات العاشقین۔ نسخہ عکسی کتابخانہ اسمعیلی خوانساری، تہران۔ صفحہ ۱۰۶۳ تا ۱۰۷۱

اُن کی دسترس میں تھے یا نہیں۔ بہر حال محمد قزوینی نے "الشہید" کے بارے میں مقدمہ میں
لکھا ہے "معلوم نشد بہ چہ مناسبت اطلاق کلمہ شہید براو شدہ است"۔ ہمیں بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کیوں
"الشہید" لکھا گیا ہے۔ البتہ ایک حکایت جو چند تذکروں میں درج ہے اس ضمن میں بیان کرنی ضروری ہے
حافظ کی غزلوں پر شاہ شجاع کی نکتہ چینی کی طرف اشارہ کیا گیا۔ حسین پژمان نے مقدمہ دیوان
حافظ میں لکھا ہے کہ حافظ کے جواب سے جب شاہ شجاع کو اپنے قول کی تکذیب ہوتی نظر آئی تو اس نے
ارادہ کیا کہ حافظ کو تنبیہہ کرے بلکہ اُسے "دیار عدم" میں بھیج دے۔ یہ مصیبت شیخ زین الدین ابوبکر تایبادی کی
نکتہ سنجی سے ٹل گئی۔ آگے چل کر یہی مقدمہ نویس "عرفات العاشقین" سے نقل کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس پیر
کامل کی راہنمائی سے حافظ پر کوئی آفت آنے نہ پائی اور شاہ شجاع کے حضور سے سالماً غانماً نکل آیا۔ اس قصہ
کے دوران اس کے گھر کی مستورات نے تمام مسودوں کو پارہ پارہ کیا اور دھو ڈالا تا کہ اُن سے
کہیں اور مصیبت نہ آئے۔ خواجہ اس واقعہ سے بہت متاثر ہوئے، انہی ایام میں جوار ایزدی سے پیوست ہوئے
فرصت نے اپنے تذکرہ "دریای کبیر" میں یہ عبارت لکھی ہے: "واینکہ گویند بعضی از سلاطین عصر
خواجہ را چوب زدہ دیوانش را در آب افگند، پس از فوت خواجہ پشیمان شد۔"
صاحب عرفات العاشقین اور دریای کبیر کی عبارات سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ غالباً
شاہ شجاع کی طرف سے حافظ کی شدید تہدید کی گئی تھی جس کی وجہ سے وہ سخت غمگین ہوئے اور
غالباً پیرانہ سالی میں اس ذہنی اور روحانی عذاب کی تاب نہ لا کر انہی ایام میں رحلت کر گئے۔ اسی
لحاظ سے مقدمہ میں "المرحوم الشہید" کی اصطلاحیں لائی گئی ہیں۔ صاحب عرفات لکھتا ہے کہ شاہ
شجاع نے اس کی صرف تنبیہہ ہی نہیں کی بلکہ "دیار عدم" میں بھیجنے کا بھی ارادہ کیا۔ اس بیان کو جب
فرصت کی عبارت کے ساتھ تطبیق دی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے خواجہ صاحب نے جسمانی چوٹیں
کھا کر چند دنوں کے اندر رحلت کی ہو اور شہادت کا درجہ پایا ہو۔ لیکن اس استنباط کو قبول کرنے میں
ایک مشکل پیش آتی ہے۔ شاہ شجاع پر تہمت لگانے میں بڑی نادرستی ہے کہ شاہ شجاع حافظ سے پانچ یا چھ
سال پہلے ہی فوت ہو چکا تھا اور حافظ نے اس کی وفات پر مادہ تاریخ بھی کہا۔ صاحب عرفات کا یہ

زیادہ تر قیاس اور گمان پر ہی مبنی ہے۔ یہ مفروضات اکثر ایسے اشعار سے اخذ کئے گئے ہیں جن میں جستہ جستہ شخصی حالات کے اشارے ملتے ہیں۔ براؤن کے علاوہ شبلی نعمانی نے بھی اسی روش پر عمل کیا ہے اور شاید اس خاص موضوع میں اس کے علاوہ تحقیق کا کوئی دوسرا راستہ نہیں۔

حافظ کے آباد اجداد کا ذکر گزشتہ اوراق میں ہو چکا۔ معلوم ہوا ہے کہ اس کے دو بھائی تھے جو باپ کی موت کے بعد پراگندہ ہو گئے۔ دیوان حافظ میں ایک قطعہ خواجہ عادل کی تاریخ وفات میں ملتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس کا بھائی تھا۔ یہ قطعہ قزوینی اور حسین پژمان دونوں کے مرتبہ دیوان میں ملتا ہے۔

برادر خواجہ عادل طاب مثواہ　　پس از پنجاہ و نہ سال از وفاتش

بسوی روضہ رضوان سفر کرد　　خدا راضی ز افعال و صفاتش

خلیل عادلش پیوستہ برخوان　　وز آنجا فہم کن تاریخ سالش

"خلیل عادل" سے ۷۷۵ھ حاصل ہوتا ہے۔

حافظ کی اولاد کے بارے میں پتہ چلتا ہے کہ اس کے دو فرزند اس کی رحلت سے پہلے ہی چل بسے تھے۔ ان میں ایک تو چھوٹی عمر ہی میں گزر گیا تھا۔ اس کو مکتب میں بٹھایا گیا تھا، مگر دست قضا نے اس غنچہ کو کھلنے سے پہلے ہی توڑ لیا چنانچہ:

دلا دیدی کہ آن فرزانہ فرزند　　چہ دید اندر خم این طاق رنگین

بجای لوح سیمین در کنارش　　فلک بر سر نہادش لوح سنگین

اسی فرزند یا شاید اس کے علاوہ کسی اور کی المناک موت کا غم حافظ نے ایک غزل میں بیان کیا ہے:

بلبلی خون دلی خورد و گلی حاصل کرد　　باد غیرت بصدش خار پریشان دل کرد

طوطیی را بخیال شکری دل خوش بود　　ناگہش سیل فنا نقش امل باطل کرد

استنباط ہے کہ انتقال سے قبل ایسے حالات رونما ہوئے تھے جن کی بنا پر خواجہ حافظ کو اپنا دیوان یا دیوان کے اوراق ضایع کرنا پڑے۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ وقت کے حکمران کی رضامندی کے خلاف چاہے کسی بنا پر بھی ہو لکھا نہیں جا سکتا تھا، عین ممکن نہیں، بلکہ یقینی ہے کہ تنگ نظر اور ظاہر دار متعصب اور منافق لوگوں سے حافظ پہ یہ آفت آئی ہو۔ ان باتوں کی بنا پر اگر یہ فرض کیا جائے کہ فرصت کی عبارت میں عدم صحت کی گنجائش کم ہے تو تعجب نہیں ہونا چاہیئے پس کلمۂ "الشہید" کو مقدمہ نویس نے بغیر کسی وضاحت کے غیر محسوس طریقہ پر درج کیا ہے۔ اس ضمن میں ایرانی محققوں کی خاموشی قابلِ غور ہے خصوص علّامہ قزوینی کی۔ انھوں نے اپنے مرتبہ دیوان حافظ کے حاشیہ میں صرف یہ کہہ کر بات ختم کر دی ہے کہ مجھے معلوم نہ ہو سکا اور اس طرح اپنی تحقیق اور تجسّس کی حس کو جو حد سے زیادہ جزرس ہے مفلوج کر کے رکھ دیا۔

۱۶۔ حافظ کے خویشاوند

پروفیسر براؤن کو شکایت ہے کہ ایرانی تذکرہ نویس عام طور پر شاعروں اور ادیبوں کی شخصی زندگی کے حالات تلاش کرنے میں غفلت سے کام لیتے ہیں، یہ شکایت بسا اوقات درست ہے۔ پروفیسر مذکور کی عبارت سے غالباً یہ معنی بھی لیے جا سکتے ہیں کہ اگر حافظ جیسے مشہور شاعر کی شخصی یا خانگی زندگی کے بے کم و کاست لکھے بھی گئے ہوں تو وہ ایرانیوں نے نہیں لکھے، ہندوستانی تذکرہ نویسوں کے متعلق ان کی رائے کچھ اچھی نہیں رہی ہے۔

حافظ سے متعلق کئی داستانیں ہندوستانی تذکرہ نویسوں نے لکھی ہیں، ان میں ایک رسالہ "لطیفۂ غیبیہ" ہے جو شیراز میں ایک بار چھپ بھی چکا ہے۔ پروفیسر محمد معین نے اپنی کتاب "حافظ شیریں سخن" میں اس رسالہ میں مندرج حافظ سے متعلق بہت سی کہانیوں کی تکذیب کی ہے۔

بہر حال حافظ کی گزشتہ زندگی اور گھرانے سے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ

حکمت نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"میں نے بھی اس پتھر کو دیکھا۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ اس کے متعلق اتنا بے فائدہ شور و غل بپا کیا گیا کہ آثار قدیمہ کی چوری کرنے والے اس پتھر کو گراں بہا سمجھ کر چرا لے گئے۔"[۱]

لیکن چوں کہ سنگِ مزار پر کندہ شدہ "تاریخ اور قطعہ "آں میوۂ بہشتی" سے اخذ ہونے والی تاریخوں کے درمیان چھ سال کا فرق پڑتا ہے' اس لیے یا تو یہ فرض کرنا ہوگا کہ حافظ کے دو فرزند ۷۶۸ھ میں بہ ترتیب وفات پا گئے (بشرطیکہ قطعہ زیر نظر فرزند ہی کی وفات پر کہا گیا ہو) یا یہ کہ تاریخوں میں سہواً اختلاف پڑ گیا ہو۔ اب تک ہم نے جو مفروضے قایم کئے ہیں ان کی بنا پر حافظ کے تین فرزند معلوم پڑتے ہیں یعنی پہلا کمسنی میں ہی چل بسا۔ دوسرا ۷۸۱ھ میں جب کہ حافظ اکیاون برس کے تھے۔ اور تیسرا ۷۸۴ھ میں جب کہ وہ ستاون برس کے تھے۔ ان میں سے کسی فرزند کی تاریخ تولد معلوم نہیں۔ اس لیے ان وجوہات پر مندرجہ بالا قول کی تردید مشکل نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ حافظ کے ایک اور فرزند کا بھی پتہ چلتا ہے۔

تاریخ فرشتہ میں درج ہے کہ شاہ نعمان نام کا حافظ کا بیٹا تجارت کا شغل کرتا تھا۔ وہ ہندوستان میں فوت ہوا' اور برھان پور میں دفن کیا گیا۔ اس عبارت کو غلام علی آزاد بلگرامی نے خزانۂ عامرہ میں نقل کیا ہے اور شاہ نعمان کا مدفن اسیر گڑھ بتایا ہے پروفیسر براؤن نے خزانۂ عامرہ کے حوالہ ہی سے اس بات کو دھرایا ہے جیسین ٹریان نے قول مذکور کے سقم و صحت کی ذمہ داری فرشتہ پر ڈالی ہے اور ھاشم رضی نے اس کی صحت پر شک کا اظہار کیا ہے۔

---

(۱) از سعدی تا جامی صفحہ ۳۸۵

آہ و فریاد از چشم حسود مہ و مہر | در لحد ماہ کمان ابروی من منزل کرد
قرۃ العین من آن میوۂ دل یادش باد | کہ خود آسان بشد و کار مرا مشکل کرد

دوسرے بیٹے کے متعلق ہماری اطلاع ایک قطعہ پر مبنی ہے۔

آن میوۂ بہشتی کآمد بدست ایجان | از کف چرا بہشتی و در دل چرا نکشتی
تاریخ این حکایت گر از تو باز پرسند | سرجملہ اش فرو خوان از میوۂ بہشتی

اس سے سال ۷۷۸ حاصل ہوتا ہے۔

اس ضمن میں ہماری توجہ شیراز سے چھپنے والے سال ۱۳۱۱ھ شمسی کے "مجلہ دختران" نام کے رسالے کی طرف مبذول ہوئی ہے" اس سے پتہ چلتا ہے کہ شیراز کے "قریب دار السلم" قبرستان میں ایک سنگ مزار ملا ہے جو غالباً حافظ کے بیٹے قطب الدین کی قبر پر ڈالا گیا تھا، اس پر تاریخ وفات ۷۸۴ھ کندہ کی گئی ہے۔ مجلہ دختران کی عبارت یوں ہے:

"دو سال قبل آقای شعاع شیرازی در قبرستان دار السلم سنگی یافتہ اند کہ روی آن عبارت و قطعہ ذیل منقور بود:

"وفات خواجہ قطب الدین علی بن خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی ۷۸۴"+

مجید زادہ صہبا نے "سخنی چند در بارہ حافظ" میں لکھا ہے کہ:

میں نے ۱۳۱۴ھ میں اس پتھر کو جو مستطیل مکعب شکل میں تراشا ہوا ہے۔ قبرستان دار السلم کے راستے میں پڑا ہوا دیکھا۔ بڑی کوشش کے باوجود اس کے بالائی حصہ پر کندہ شدہ عبارت پڑھی نہ جا سکی۔ البتہ کونوں پر مندرجہ ذیل دو بیت صاف نظر آئے۔

ای سرو ناز گلشن فردوس جای تست | ای روح قدس روضۂ رضوان سرای تست
دنیا و مال و جاہ و جوانی گزاشتی | عقبی و روح روضۂ رضوان سرای تست

(۲)

یارب آن آہوی مشکین بختن باز رسان | وآن سہی سرو خرامان بچمن باز رسان
دل آزردۂ ما را بہ نسیمی بنواز | یعنی آن جان ز تن رفتہ بتن باز رسان
ماہ و خورشید بمنزل چو بامر تو رسند | یار مہروی مرا نیز بہ من باز رسان
دیدہ ہا در طلب لعل یمانی خون شد | یارب آن کوکب رخشان بہ یمن باز رسان
سخن اینست کہ ما بی تو نخواہیم حیات | بشنو ای پیک خبر گیر و سخن باز رسان

آن کہ بود وطنش دیدۂ حافظ یارب
بمرادش ز غریبی بوطن باز رسان

حافظ کی اولاد کے متعلق اپنی معلومات قلبند کرنے کے بعد ہم شاخ نبات کے نام سے مشہور کی گئی حافظ کی معشوقہ کے بارے میں بحث کریں گے۔ یہ افسانہ بھی گویا فرضی اور خیالی ہے۔ کیونکہ اس کی تصدیق کسی بھی اہم اور مستند تذکرے سے نہیں ہو سکی۔ عام لوگوں نے اس شعر کی بنا پر شاخ نبات کو حافظ کی معشوقہ خیال کرنے میں تقویت پائی ہے:

آن ہمہ شہد و شکر کز سخنم می ریزد
اجر صبریست کز آن شاخ نباتم دادند

براؤن نے لکھا ہے کہ شاخ نبات نام کی دوشیزہ کے ساتھ حافظ کے معاشقہ اور ازدواجی زندگی کے بارے میں جو افسانہ مشہور ہے اس کی تصدیق کسی استوار دلیل سے نہیں ہوتی۔ حسین پژمان نے براؤن کے خیال کی تائید کی ہے۔ البتہ اس نے ایک دلچسپ نکتہ کی طرف ہماری توجہ کو مبذول کیا ہے۔ حافظ کی غزل:

"در ہمہ دیر مغان نیست چو من شیدائی"

کا حوالہ دیتے ہوئے اس نے لکھا ہے کہ یہ وہی غزل ہے جو حافظ کی گرفتاری کی موجب بنی، اور اس سے یوں مستفاد ہوتا ہے کہ خواجہ حافظ ایک دوشیزہ کی طرف مائل

شاہ نعمان کے بارے میں کوئی تاریخی اطلاع نہیں ملتی۔ تذکرہ نویسوں نے غالباً دیوان حافظ میں ایک دو ایسی غزلوں کی بنا پر شاہ نعمان کے ہندوستان جانے کا مفروضہ قبول کیا ہے جن میں غریب الوطنی کا مضمون لطیف اور اثر انگیز انداز سے بیان ہوا ہے۔ "دیار غریب" کے اشارہ کا ہندوستان کی طرف ہونا اس لیے بھی قابل قبول ہے کہ اُن دنوں فارس یعنی جنوب ایران سے اکثر ہندوستان کی طرف تجارت کی غرض سے آتے تھے۔ دوسرے کسی ملک کی طرف کمتر جاتے تھے۔ جن دو غزلوں کی طرف ہمارا اشارہ ہے اور جن سے حافظ کے بیٹے کے سفر پر جانے، اور حافظ کی یہ آرزو کہ وہ مراجعت کرے وغیرہ قیاس آرائی کی تائید ہوتی ہے، درج ذیل ہیں:

زگریہ مردمِ چشمم نشستہ در خونست   ببین کہ در طلبت حالِ مردمان چونست
بیادِ لعلِ تو و چشمِ مستِ میگونت   زجامِ غم میِ لعل کہ میخورم خونست
زمشرقِ سرِ کوی آفتابِ طلعتِ تو   اگر طلوع کند طالعم ہمایونست
حکایتِ لبِ شیرین کلامِ فرہادست   شکنجِ طرۂ لیلیٰ مقامِ مجنونست
دلم بجو کہ قدت ہمچو سرو دلجویست   سخن بگو کہ کلامت لطیف موزونست
زدورِ بادہ براحتی بجان رسان ساقی   کہ رنجِ خاطرم از جور دورِ گردونست
ازان دمی کہ زچشمم برفت رود عزیز   کنارِ دامنِ من ہمچو رودِ جیحونست
چگونہ شاد شود اندرون غمگینم   باختیار کہ از اختیار بیرونست
زبے خودی طلب یار می کند حافظ
چو مفلسی کہ طلبگارِ گنجِ قارونست

(۱) یہ دونوں غزلیں محمد قزوینی کے مرتبہ دیوان حافظ سے نقل کی گئی ہیں، باقی نسخوں میں اختلاف پایا گیا ہے۔

(۲) ملا سودی نے شرح سودی بر حافظ میں رود کے معنی بیٹا بتائے ہیں۔ لغت نامہ دہخدا بھی ملاحظہ ہو۔

ملتی کہ حافظ کسی دوشیزہ (یا کوئی دوشیزہ جس کا نام شاخ نبات ہو) کے عشق میں مبتلا تھے۔ علاوہ ازیں یہی وہ غزل ہے جس پر مشہور عالم جلال الدین دوانی نے عرفانی مطالب پر مبنی شرح لکھی تھی۔ قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المومنین کی مجلس ہفتم میں علاّمہ دوانی کی شرح کا حوالہ دیا ہے اور آخر کار یہ شرح تہران کے ادبی رسالہ "ارمغان" کے ۱۳۲۰ھ شمسی کی اشاعت میں چھپ گئی۔ جلال الدین، حافظ کے زمانے سے بہت دور نہیں تھا، اس لیے اس کی لکھی ہوئی شرح بڑی اہمیت کی حامل ہے اور اس لحاظ سے حسین پژمان کا عقیدہ اس غزل میں "ایجاد کانون خانوادگی" کی خواہش پائی جاتی ہے، رد ہوتا ہے۔ چوں کہ اس غزل پر کافی لے دے ہوئی ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ اسے سہولت مطالعہ کے لیے یہاں نقل کیا جائے۔

در ہمہ دیر مغاں نیست چو من سودائی — خرقہ جائی گرو بادہ و دفتر جائی
دل کہ آئینۂ شاہیست غباری دارد — از خدا می طلبم صحبت روشن رائی
کردہ ام توبہ بدست صنم بادہ فروش — کہ دگر می نخورم بی رخ بزم آرائی
نرگس ارلاف زد از شیوۂ چشم تو مرنج — نروند اہل نظر از پی نابینائی
شرح این قصہ مگر شمع بر آرد بزبان — ورنہ پروانہ ندارد بہ سخن آرائی
جوییہا بستہ ام از دیدہ بدامان کہ مگر — در کنارم بنشانند سہی بالائی
کشتیِ بادہ بیاور کہ مرابی رخ دوست — گشتہ ہر گوشۂ چشم از غم دل دریائی
سخن غیر مگو با من معشوقہ پرست — کز وی و جام میم نیست بکس پروائی
این حدیثم چہ خوش آمد کہ سحر گہ میگفت — بر در میکدہ با دف و نی ترسائی

گر مسلمانی از نیست کہ حافظ دارد
آہ اگر از پیِ امروز بود فردائی

بہر حال اگر شاخ نبات نام کی معشوقہ کا افسانہ درست ہو تو کہنا چاہیے

تھے، لیکن اُس کے خویشاوندوں نے ایک بے سروسامان شخص کو اپنا داماد بنانے سے انکار کر دیا۔

پژمان کے اس بیان کے بارے میں چند باتیں زیرِ نظر لانی ہوں گی۔

اوّل یہ کہ اس نے متذکرہ بالا بیان کو کس تذکرہ یا تاریخ کے حوالہ پر مبنی کیا ہے، ہمیں معلوم نہیں، اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ محض قیاس آرائی ہے۔

دوم یہ کہ کلمہ "گرفتاری" جدید فارسی میں وہ معنی نہیں رکھتا جو ہم قدیم فارسی یا اُردو میں سمجھتے آئے ہیں، یعنی قید۔ اس کے معنی مصیبت یا پریشانی میں مبتلا ہونا ہیں۔

سوم اگر پژمان کا یہ قول کہ حافظ کی معشوقہ کے خویشاوند و شادی کے خلاف تھے، قابلِ اعتبار مانا جائے تو یہ ممکن ہے کہ انھوں نے شاہ شجاع کے پاس جا کر حافظ کی بدگوئی کی ہو، اور غزل مذکور کے ایک شعر کو اس کی اذیت کے لیے چنا ہو۔ ایسی صورت میں صاحبِ عرفات کا لفظ "معاندین" کا لانا معنی خیز ہے۔

حسین پژمان کے بیان کی تردید کی کافی گنجایش نظر آتی ہے۔ ایک طرف وہ لکھتا ہے کہ یہی غزل حافظ کی گرفتاری کا باعث بنی، دوسری طرف کئی تذکروں میں ذکر ہوا ہے کہ اس غزل کے ایک شعر کے جنجال کے بعد ہی حافظ گوشہ نشین ہو کر رحلت کر گئے۔ اس بیان سے اخذ ہوتا ہے کہ حافظ نے یہ غزل زندگی کے آخری ایام میں کہی تھی۔ اگر ایسا ہی ہو تو اس کے ساتھ ایک دوشیزہ کا عشق، اور اس کے خویشاوندوں کی طرف سے مزاحمت والا افسانہ ملحق کرنا بے معنی سی بات ہے۔ حسین پژمان کا استنباط شاید اس غزل کے تیور سے حاصل ہوا ہے۔ اس کا قول ماننے میں ہمیں یوں تو کوئی بڑی دقت درپیش نہیں کہ زیرِ نظر غزل میں حافظ نے اپنے مخصوص لطیف اور رمزی انداز میں اپنی مجردانہ زندگی کی بے سروسامانی اور گھر بسانے کی ایجاد کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ لیکن اس سے یہ سوچنے میں کوئی تقویت نہیں

چوتھا باب

عصرِ حافظ

خواجہ حافظ کے زمانے کی تاریخ کا غور سے مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوگا کہ وہ ہر حساس شاعر کی طرح اپنے وقت کے سیاسی حالات سے متاثر ہوتے رہے ہیں، اور اپنے تاثر کا اظہار رمز و کنایہ میں کرتے رہے ہیں۔ جدید ایرانی محققوں نے حافظ کی غزلوں کی ایک خاصی تعداد کو اُس وقت شیراز اور اس کے آس پاس رونما شدہ سیاسی حالات کے پس منظر کے ساتھ تطبیق دینے کی کوشش کی ہے۔ ایسی غزلوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ بعض اوقات اس طرح کا نتیجہ نکالنے والوں کی رائے میں مبالغہ کا شک ہوتا ہے لیکن جو شخص اُس وقت کی سیاسی اور سماجی تاریخ سے بخوبی واقف ہے اور ساتھ ہی حافظ کی روش کو بھی اچھی طرح جانتا ہو وہ اُن کے لطیف اور غیر محسوس اشاروں کو زیادہ زحمت کے بغیر سمجھ سکتا ہے۔ انھوں نے بسا اوقات شاہان وقت کو کنایہ میں محبوب اور دوست جیسے الفاظ سے مخاطب کیا ہو اور اس کے دشمنوں کو رقیب و حریف سے۔ اسی پردہ میں انھوں نے سلطان وقت کے تئیں اپنی ارادت

حافظ اُس کو اپنے نکاح میں لائے ہوں گے، اور اس رشتۂ ازدواج سے از بس خرسند ہو کر اطمینان کی زندگی بسر کرتے ہوں گے۔ مندرجہ ذیل غزل سے حسین بُژمان نے بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ حافظ نے یہ غزل اُن قدیم یاران ہم مشرب کی نظر سے گزارنے کے لیے لکھی ہوگی، جو اُس کو حسب معمول عیش و طرب کی دعوت دیتے رہے ہوں گے۔

مرا شہر طلیشت با جانان کہ تا جانان در بدن دارم
ہوا داری کویش را بجان خویشتن دارم

حیان

از روئے قیاس یہ بھی بتایا گیا ہے کہ حافظ کی رفیق حیات اس سے پہلے ہی رحلت کر چکی تھی اور یہ صدمہ اُن کے لیے جانکاہ تھا۔ مندرجہ ذیل غزل سے اس قیاس کو تقویت پہنچتی ہے:۔

آن یار کز و خانہ ما جائے پری بود
سر تا قدمش چوں پری از عیب بری بود

دیوان حافظ میں ہماری نظر سے ایسا کوئی قطعہ نہیں گزرا ہے جس میں حافظ نے صراحت سے اپنی اہلیہ کا ذکر کیا ہو یا اس کی رحلت پر مادۂ تاریخ کہا ہو، جیسے کئی دیگر لوگوں کے لیے کہے جا چکے ہیں۔ ان کی شخصی زندگی کے مختصر سے حالات جو سطور بالا میں بیان ہوئے فی الجملہ ظن اور قیاس پر ہی مبنی ہیں۔ ان کی درستی کی تصدیق ایک مشکل اور بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔

محنت بی حد و شمار وغیرہ ترکیبیں علامتی ہیں، اور رہبر حسن چوپان کی سفاکی اور اس کے ظلم وستم کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اس کے برعکس باد بہار۔ اقبال کلہ۔ گوشۂ گل ہنگار۔ صبح امید۔ گیسوی نگار۔ قدحی پر می وغیرہ خوش بیں اصطلاحیں۔ شاہ شیخ ابو اسحاق کی انصاف انصاف پروری اور رعیت دوستی کو ظاہر کرتی ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ غزل حافظ کی شاعرانہ زندگی کے ابتدائی دور کی ہو، کیونکہ اول تو تاریخ کے لحاظ سے سطور بالا میں ایک دلیل پیش کی گئی ہے دوسرے یہ کہ اس مقطع میں شاعر نے انکشاف کیا ہے کہ مجھے کوئی خاطر میں نہیں لاتا اور سیاسی ماحول سے جلدی اور شدت سے متاثر ہوتا ہے بلکہ اپنا ردعمل بھی ظاہر کرتا ہے۔

سیاسی حالات کی طرف محتاط اشارات کو حافظ کی غزلوں کا اہم عنصر خیال کرنا چاہیے۔ اور ان کی ان تمام غزلوں کو جن میں تاریخی یا سیاسی واقعات کی طرف خفیف یا واضح اشارہ ہو سنجیدگی سے اور افراط و تفریط کے بغیر زیر غور لانا چاہیے۔ چونکہ یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک حافظ کا پورا اور عمیق مطالعہ نہ کیا جائے اور ہر مورد نظر غزل کو فرداً فرداً سامنے نہ لایا جائے۔ اس لیے ہم نے عصر حافظ کے عنوان سے زیر تحریر باب کا اضافہ ضروری سمجھا ہے تاکہ اُن حالات کی روشنی میں حافظ کی شخصیت نمایاں طور پر ہمارے سامنے آئے جو اُن کے شعور اور لاشعور میں جاگزیں ہو چکے تھے۔ اگرچہ گزشتہ اوراق میں ہم نے جستہ وگریختہ چند تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے، لیکن ان سے ہمارا مقصد پورا نہیں ہوتا۔

حافظ کی زندگی کا زمانہ ساٹھ اور ستر برس کے درمیان کا ہے یعنی غالباً ۷۲۰ھ سے لے کر ۷۹۲ھ تک۔ لیکن سہولت کار کے لیے ہم پوری آٹھویں صدی ہجری کے تاریخی واقعات کا اجمالی طور پر جائزہ لیں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم اس صدی کی ابتدائی اور آخری حدود سے کسی قدر تجاوز کریں اور کچھ غیر متعلقہ واقعات کو درج کریں۔ اس سے مدعا صرف اس قدر ہے کہ جس زمانے کو ہم زیر بحث لا رہے ہیں، اور جن خاص واقعات کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرنا چاہتے ہیں، ان پر مکمل روشنی پڑے، تاکہ پس و پیش اور

اور اپنی محبت کا اظہار کیا ہے اور اس کے دشمنوں کے ہاتھوں ڈھائے گئے مظالم کی نکوھش کی ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت ہم صرف ایک مثال سے کریں گے۔ اگرچہ اگلی سطور میں مناسب مقام پر اس موضوع پر مزید روشنی ڈالنے کا امکان ہے۔

حافظ کی ایک غزل کو شیراز کے چوپانی خاندان کے حکمراں امیر پیر حسین کے انقراض اور اس کے ذریعے ڈھائے گئے مظالم سے نجات اور شاہ شیخ ابو اسحاق اینجو کے برسرِ حکومت آنے سے متعلق خیال کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ ۷۴۳ھ میں رونما ہوا۔ اور اگر یہ مانا جائے کہ حافظ ۷۱۰ھ میں تولد ہوئے تھے تو امیر پیر حسین کے قتل کے وقت ان کی عمر چھبیس برس کی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ ان سیاسی حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے ہونگے اور مندرجہ ذیل غزل میں اپنے تاثرات کا اظہار ضرور اس طرح کیا ہے:

روز ہجران و شب فرقت یار آخر شد
زدم این فال و گذشت اختر و کار آخر شد

آن ہمہ ناز و تنعم کہ خزان می فرمود
عاقبت در قدم باد بہار آخر شد

شکر ایزد کہ باقبال کلہ گوشہ گل
نخوتِ باد دی و شوکتِ خار آخر شد

صبح امید کہ بد معتکف پردہ غیب
گو برون آی کہ کار شب تار آخر شد

آن پریشانی شب ہلئے دراز و غم دل
ہمہ در سایہ گیسوئے نگار آخر شد

بادرم نیست ز بد عہدی ایام ہنوز
قصہ غصہ کہ در دولتِ یار آخر شد

ساقیا لطف نمودی قدحت پر می باد
کہ بہ تدبیر تو تشویش خمار آخر شد

در شمار ارچہ نیاورد کسی حافظ را
شکر کان محنت بی حد و شمار آخر شد

اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے امیر پیر حسن کے دور کی تباہی، اس کے ظلم و ستم اور شاہ ابو اسحاق کے دورِ حکومت کے آغاز کو صحیح مان لیں تو کئی اشارات سے اس ظن کو تقویت پہنچتی ہے۔ بطور مثال ناز و تنعم خزاں و نخوت باد دی، شوکت خار، شب تار، تشویش خمار

خاندان اور شخصیتیں نیستی اور نابودی کے گرداب میں پڑ گئیں اور شیراز کے خوش گزران لوگوں کے عیش و آرام میں عظیم خلل پڑا۔ ایسے ہی حالات کے پیشِ نظر ہم اگلے صفحات میں حافظ کی بعض غزلوں کا مطالعہ کریں گے۔

مظفری خاندان کی طرف توجہ دینے سے پہلے ایک اور اہم پہلو کو زیرِ غور لانا ہوگا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہرج و مرج اور سیاسی افراتفری کے دور میں ہی ایران میں فارسی شاعری نے زیادہ رواج پایا اور زیادہ ترقی کی۔ بطورِ مثال ان ہی پچاس برسوں کی مدت کو لیجیے۔ اس قلیل عرصہ میں ایران میں کئی صفِ اولین کے شاعر نمودار ہوئے جن میں اس ملک کا عظیم اور لافانی شاعر حافظ سرِ فہرست ہے۔ اس کے مقابلہ میں صفوی دور جو لگ بھگ ۲۳۵ برس تک برقرار رہا اور جس کے دوران ایران اپنی استحکامی قوت اور شوکت میں بے نظیر ہوا، بمشکل دو یا تین قابلِ ذکر شاعر پیدا کر سکا جن کی شہرت اتنی نہیں جتنی دورِ ماقبل کے شاعروں کی۔ البتہ صنایع مستظرفہ کی ترویج و ترقی کے لیے صفوی دور اپنی مثال آپ ہے۔ جہاں تک افراتفری اور اغتشاش کے زمانے میں شاعری اور ادب کی ترقی کا تعلق ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ایران میں شعر و شاعری کی ترویج اور شاعروں کی سرپرستی اکثر حالات میں سلاطین۔ امراء اور وزراء کے دربار سے مربوط تھی۔ چونکہ طوائف الملوکی کے زمانے میں ایک سلطان یا امیر دوسرے پر سبقت حاصل کرنا چاہتا تھا اس لیے وہ دوسروں سے بڑھ کر شعراء کی ہمت افزائی کرتا، بلکہ بعض اوقات کسی مشہور شاعر کو لالچ دے کر ایک سلطان کے دربار سے الگ کر کے خواہشمند سلطان کے دربار میں بلایا جاتا۔ اگرچہ حافظ آزاد فکر اور بے حرص آدمی تھے۔ تاہم ان کے یزد کے سفر کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہاں کے شاہ سے زیادہ مالی سہولت کی امید رہی ہو۔ علاوہ ازیں کئی غزلوں سے اشارہ ملتا ہے کہ وہ تبریز، اصفہان اور

شک تردید کو حتی الامکان کم کر دیا جائے۔

تیمور کی ولادت اور چنگیزی خاندان کے آخری بادشاہ سلطان ابوسعید کی موت کے ایک ہی سال یعنی ۷۳۶ھ میں واقع ہوئی۔ اس کے لگ بھگ پچاس سال بعد یعنی ۷۸۶ھ تک بلکہ آٹھویں صدی کے اختتام تک ایران میں پانچ مقابلتاً چھوٹے چھوٹے خاندان ملک کی مختلف نواحی میں برسر اقتدار رہے۔ ان کی فہرست یوں ہے:

۱۔ آل مظفر۔ فارس، عراق، عجم اور کرمان۔

۲۔ آل جلایر۔ بغداد اور آذربائیجان میں۔

۳۔ آل سربدار۔ سبزوار میں۔

۴۔ ملوک کُرت۔ ہرات اور شمال مشرق ایران میں۔

البتہ مظفریوں کے ساتھ شاہ شیخ ابواسحاق اینجو کا نام بھی آتا ہے۔ چونکہ مظفری خاندان کے بانی اولین سلطان مبارزالدین اور شاہ شیخ ابواسحاق کی تاریخ ایک دوسرے سے مرتبط ہے اس لیے لازمی طور پر اس کا ذکر مناسب مقام پر اور متعلقہ واقعات کے دوران کیا جائے گا۔ فی الحال اس کے متعلق اتنا کہنا کافی ہے کہ ۷۴۴ھ میں چوپانی خاندان کا آخری بادشاہ شیخ ابواسحاق کے ہاتھوں نیست نابود ہوا اور ابواسحاق نے شیراز میں مستقر ہو کر اپنے آپ کو رسمی طور پر فارس کا بادشاہ کہلوایا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنی زندگی کے آخری دن تک رہنے والی کشمکش میں مبتلا ہوا اور آخر کار مظفریوں کے پہلے سلطان امیر مبارزالدین کے ہاتھوں اس کا اور اس کے خاندان کا خاتمہ ہوا۔

جس دور کا ذکر ہم نے شروع کیا ہے، وہ ایران اور فارس کی تاریخ کے خوفناک ترین ادوار میں شامل ہے۔ اس دور میں شیراز ہی نہیں، بلکہ سارا فارس پے در پے کشت وخون کے حادثوں میں پڑتا اور ان سے باہر نکلتا رہا۔ ایک تیموری آشوب کا ہنگامہ بپا تھا اور دوسری طرف مظفریوں نے سفاکی اور ظلم وجبر کا بازار گرم کر رکھا تھا کہ عظیم

سے فرار کر کے یزد میں آئے تھے۔ اُس وقت یزد کی حکومت اصفہان کے حاکم ابو جعفر علاء الدولہ کاکویہ دیلمی کی اولاد کے ہاتھوں میں تھی۔ یہ وہی علاء الدولہ ہے جس کے دربار میں شیخ الرئیس ابن سینا نے اپنی زندگی کے آخری دن کاٹے تھے اور اپنی ایک مشہور کتاب "دانشنامہ علائی" کو اُسی کے لیے فارسی میں لکھا تھا۔ علاء الدولہ کے حکمران خاندان کو "اتابکان یزد" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ امیر غیاث الدین حاجی کے تین بیٹے تھے جن میں سے دو شاہ علاء الدین اتابک یزد کی خدمت میں شامل ہوئے۔ اتابک علاء الدین کی وفات کے بعد یعنی ۶۶۲ ہجری سے لے کر ۶۹۰ ہجری تک اس کا بیٹا اتابک یوسف شاہ یزد کا حکمران رہا اور اُس نے میبد اور ندوشن کی حکومت امیر غیاث الدین کے پوتے شرف الدین مظفر کو سونپ دی۔ کئی تذکروں اور بخصوص محمود گیتی نے تاریخ آل مظفر میں شرف الدین مظفر کے ایک عجیب خواب کی داستان بتائی ہے۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ

> "اتابک علاء الدین کے گھر سے سورج نکلتا ہے اور اُس کے اپنے گریبان میں جا پڑتا ہے، جب وہ اُٹھتا ہے تو آفتاب کے چند ٹکڑے اُس کے دامن سے گر جاتے ہیں۔"

اس خواب کی تعبیر ایک بزرگ سے پوچھی گئی۔ اس نے کہا کہ بشارت ہو کہ اتابکوں کے خاندان سے سرداری نکل کر تمہارے خاندان میں آ جائے گی۔ حبیب السیر میں تعبیر گو کا نام شیخ دادا بتایا گیا ہے، لیکن ہمیں معلوم نہ ہو سکا یہ کون شخص ہے۔

رفتہ رفتہ امیر شرف الدین مظفر نے اپنی سرداری کی حدود میں بڑا اقتدار حاصل کیا، جب اتابک یوسف شاہ نے ایلخانیوں سے سرکشی کی تو غازان کی فوجیں امیر محمد ابداجی کی سرکردگی میں یزد پر حملہ آور ہوئیں۔ مقاومت کی تاب نہ لا کر یوسف شاہ نے سیستان کی طرف فرار کیا۔ امیر مظفر کچھ دیر کے لیے بطور ملازم اس کا ہمرکاب رہا اور پھر الگ ہو کر کرمان میں سلطان جلال الدین سیورغتمش قراختائی کی ملازمت اختیار کی۔ تھوڑی مدت کے بعد پھر

بغداد کو جانے کی خواہش بھی رکھتے تھے۔ اس خواہش کی نمود دراصل وہاں کے سلاطین سے عنایات اور تفقدات کی امید سے وابستہ تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ شاید ان کے ذاتی حالات اس خواہش کو پورا کرنے کے مساعد نہ تھے، لہٰذا ان سفروں کے ارادوں سے منحرف ہوئے۔ اگر ہندوستان کے مبینہ سفر کی داستان کو صحیح مانا جائے تو ایک پھر یہی کہنا ہوگا کہ حافظ بہمنی یا بنگالہ کے سلطان سے نوازشات کی توقع رکھتے ہوں گے۔

۱۔ آل مظفر اور آل اینجو

۷۰۸ھ میں یزد کے حکمران خاندان اتابکان یزد کا زوال ہوا اور منگولوں کے آخری بادشاہ ابو سعید کی طرف سے وہاں کی حکومت کی باگ ڈور مظفری خاندان کے بانی امیر مبارزالدین محمد کو سونپی گئی۔ یہ خاندان ۷۹۵ ہجری تک برسر اقتدار رہا اور اسی سال نہ صرف اس کا آخری بادشاہ شاہ منصور امیر تیمور کے ہاتھوں قتل ہوا بلکہ اس خاندان کے تقریباً تمام شہزادے قتل کر دیے گئے۔ فارس، کرمان، یزد اور عراق امیر تیمور کی سلطنت میں شامل ہوئے اور مظفری خاندان نے تقریباً ستر برس تک حکومت کی جو حافظ کے پورے دورِ حیات پر محیط ہے۔ مظفری خاندان خواف کے ایک شخص بنام امیر غیاث الدین حاجی کی نسل سے متعلق ہے۔ جامع التواریخ حسینی میں درج ہے کہ امیر غیاث الدین حاجی خراسان میں سجاوند کے قصبہ کا رہنے والا تھا۔ وہ اچھے اخلاق کا مالک تھا اور اس قدر قوی ہیکل اور بلند قامت تھا کہ جو موزہ اس کے پاؤں میں ٹھیک آئے، وہ حسب دستور بنوانا پڑتا تھا اور اس کی شمشیر یزدی وزن میں ساڑھے تین من کی تھی! امیر غیاث الدین کے اجداد ایران پر عربوں کی لشکر کشی کے دوران عرب ستان سے آکر خراسان میں بس گئے تھے اور منگولوں کے حملہ خراسان کے وقت بخصوص چنگیزی فتنہ میں خواف (خراسان)،

امیر مبارز الدین کے پاس تھا جس سے وہ اس کے پاس موجود ایک بے نظیر گھوڑا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ امیر کیخسرو برآشفتہ ہوا اور ایلخان کے پاس شکایت کی چنانچہ ایلخان نے امیر مبارز الدین محمد کو اتابک حاجی شاہ کی گوشمالی کے لیے بھیجا۔ یزد کی گلیوں میں دو طرف کے سپاہیوں کے درمیان جھڑپ ہوئی جس کے نتیجہ میں اتابک حاجی شاہ کو بھاگنا پڑا، اور اس کے ساتھ اتابکان یزد کا بھی خاتمہ ہوا۔ سال ۷۱۸ ہجری کو امیر مبارز الدین کی حکومت کا پہلا سال خیال کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اتابک حاجی شاہ کی شکست کے فوراً بعد مبارز الدین ابو سعید کی خدمت میں پہنچا اور اپنے لیے اتابکان یزد کی جانشینی کا حکم حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔

مبارز الدین مظفر کی ابو سعید ایلخانی سے ملاقات کو "تاریخ جدید یزد" میں بڑی دلچسپ کہانی کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ محمد مظفر اٹھارہ برس کا جوان تھا، اس نے اردو (منگول فوج) کی ملازمت اختیار کی، اور سلطان ابو سعید اس کی بڑی عزت کرتا تھا۔ چنانچہ اس کو تمام امرار کے اوپر نشست ملی۔ ابو مسلم نام کا ایک شخص پایہ تخت میں مشہور پہلوان تھا، سلطان ابو سعید کی محمد مظفر کی نسبت قدر و منزلت . . . . . دیکھ کر وہ حسد سے جلنے لگا۔ اس نے محمد مظفر کو آزردہ یا شرمندہ کرنے کی غرض سے اپنی کمان اسے دی کہ کھینچو۔ محمد مظفر نے اس کمان کو اپنی کمان کے ساتھ جوڑا اور پھر دونوں کو باہم کھینچ لیا۔ پھر الگ کر کے صرف اپنی کمان ابو مسلم پہلوان کو دی کہ کھینچو۔ لیکن بڑی کوشش کے باوجود وہ اسے نہ کھینچ سکا۔ شرمندہ ہو کر چلایا کہ کل میدان میں نیزہ بازی میں مہارت کا مظاہرہ کیا جائے۔ کمان اٹھانا تو سہل ہے۔

اگلے روز سلطان اور دیگر امرار اور تماشا بین میدان میں آئے۔ گھاس کا توبرہ میدان میں پھینکا گیا تھا۔ محمد مظفر نے نیزہ ہاتھ میں لیا اور گھوڑے کو سرپٹ دوڑایا۔ نیزے کو گھاس کے توبرہ پر اس زور سے مارا کہ اس کی نوک ٹوٹ گئی۔ سخت غضبناک ہوا اور نیزہ کی شکستہ نوک کو ایک بار پھر توبرہ پر دے مارا اور اس کو آسمان میں بلند کر کے

کرمان آیا اور بالآخر اغون خان اور پھر گیخاتو کے حکم سے کرمان میں کسی اہم منصب کا منصدی ہوا۔ ساتویں صدی کے اواخر میں امیر مظفر نے خزارہ کے ایک امیر کی بیٹی سے شادی کی اور اُس کے بطن سے ۷۰۰ ہجری میں امیر مبارز الدین محمد مظفرؒ متولد ہوا۔

۷۰۷ ہجری میں وہ کرمان سے شیراز آیا اور یہ کمسن لڑکا یعنی مبارز الدین اس کے ساتھ تھا۔ امیر مظفر نے اُلجاتیو سے ملاقات کی غرض سے خانقین کا سفر کیا اور اُس وقت بھی کم سن مبارز الدین اُس کے ہمراہ تھا۔ امیر مظفرؒ ۷۱۳ ہجری میں شبانکارہ میں فوت ہوا، اور مُبید کے اس مدرسہ میں دفن کیا گیا جو اُس نے خود بنایا تھا اور جس کا نام مدرسہ مظفریہ رکھا گیا تھا۔ یہی کمسن لڑکا امیر مبارز الدین محمد مظفری خاندان کا بانی ہوا جس نے تقریباً ستر برس تک شیراز اور اس کے گرد و نواح پر حکومت کی۔

۲۔ امیر مبارز الدین محمد مظفرؒ

اُلجاتیو نے مبارز الدین محمدؒ کو اُس کے باپ کی موت کے بعد یساولی (جلوداری) کا منصب دیا۔ اُلجاتیو کے بیٹے ابو سعید نے مبارز الدین کو تفویض کیئے گئے منصب پر بدستور برقرار رکھا۔ ۷۱۷ ہجری میں اُسے مبید بھیجا گیا۔ جہاں وہ شاہراہوں کی حفاظت اور وہاں کی حکومت کی نگرانی کرتا رہا۔ ان ہی دنوں فارس کے شحنہ سید عضد الدین یزدی جو مشہور شاعر جلال الدین یزدی کا باپ تھا اور ایلخانیوں کے درمیان روابط بگڑ گئے لیکن امیر مبارز الدین نے حسن نیت اور معاملہ فہمی سے کام لے کر اس قضیہ کو بغیر کسی زیاں کاری کے سُلجھا دیا، اور اس طرح ایلخانی حکمران ابو سعید کی نظروں میں اور بھی قابل اعتماد بن گیا۔

۷۱۸ ہجری میں اتابکان یزد کے آخری فرمانروا اتابک حاجی شاہ اور امیر غیاث الدین کیخسرو اینجو (شاہ شیخ ابو اسحاق کا بھائی) کے نایب کے درمیان کسی شرمناک بات پر جھگڑا ہوا۔ امیر کیخسرو کا نایب جھگڑے میں مارا گیا۔ جب یہ خبر اُسے ملی، اُس وقت وہ مبید میں

چھوٹے بیٹے ابو اسحاق اینجو نے جب کرمان کی طرف عنان عزیمت موڑی تو محمد مظفر نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ اس کا استقبال کیا لیکن وہ تھوڑی ہی مدت میں ابو اسحاق کے مخاصمانہ ارادوں سے باخبر ہوا۔ بہر حال شیخ الاسلام شہاب الدین علی کے بیچ بچاؤ سے ان کے درمیان کدورت رفع ہوئی اور ابو اسحاق واپس شیراز چلا گیا۔

ہم بتا چکے ہیں ۷۴۱ھ ہجری میں امیر چوپانی فارس میں داخل ہوا۔ امیر مبارز الدین کے ساتھ اس کے تعلقات دوستانہ تھے اور قدیم عہد و پیمان پہ کاربند رہتے ہوئے وہ جلال الدین مسعود شاہ اینجو کے خلاف ہو کر استخر میں پیر حسن سے جا ملا۔ جلال الدین نے کازرون کی طرف رُخ کیا لیکن مبارز الدین نے اس کا تعاقب نہ چھوڑا۔ بہر حال شاہ اینجو بھاگ کر بغداد کی طرف نکل گیا۔ امیر مبارز الدین نے شیراز کا محاصرہ کیا۔ لیکن شہریوں نے بڑی مقاومت کی۔ جب حالات اُن کے لیے از بس نامساعد ہوئے تو قاضی مجد الدین نے جو اس زمانہ کا بہت بڑا عالم، زاہد اور دینداار آدمی تھا، یہ شعر لکھ کر امیر مبارز الدین کے پاس بھجوایا ؎

مبارزان جہان قلب دشمنان شکنند — ترا چہ شد کہ ہمہ قلب دوستان شکنی

آخر کار صلح ہوئی اور پیر حسن چوپانی امیر مبارز الدین کی مدد سے فاتحانہ انداز میں شیراز میں داخل ہوا، اور کرمان کی حکومت مبارز الدین کو سونپ دی۔

قاضی مجد الدین کا نام سطور بالا میں لیا گیا۔ یہ وہی شخص ہے جس کو حافظ نے نیکی سے یاد کرتے ہوئے ان پانچ بزرگ شیرازیوں میں شامل کیا ہے، جنھوں نے عوام کی فلاح و رفاہ کے عوض نیک نامی حاصل کی تھی۔

قطعہ کا متعلقہ شعر یہ ہے:

دگر مربی اسلام شیخ مجد الدین
کہ قاضیی، از او آسمان ندارد یاد

قاضی مجد

ہوئے بادشاہ کے سامنے سے گزرا، اور سر کے پیچھے پھینک دیا۔ لوگوں نے شاباشی دی۔ محمد مظفر پیادہ ہو کر بادشاہ کے سامنے زمین بوس ہوا اور عرض کی۔ بادشاہ توبرہ کو کھولنے کا حکم دے۔ توبرہ کھولا گیا تو اس کے اندر سے ساٹھ من یزدی وزن کے لوہے کا ٹکڑا نیچے گرا۔ سلطان نے آفرین کہی اور خلعت اور منصب عطا کئے۔ اس طرح محمد مظفر میبد اور اس کے ملحقات کا آزاد حکمران مقرر ہوا، جس کی رکاب میں دو سو آدمی حاضر رہا کرتے تھے۔

یزد میں اپنی موقعیت مضبوط کرنے کے بعد مبارز الدین نے اپنی فرمانروائی میں ڈاکوؤں اور چوروں کا قلع قمع کرنا شروع کیا۔ ۷۲۹ ہجری میں اس نے شیراز میں قراختائی سلطان قطب الدین کی لڑکی خان قتلغ مخدوم شاہ کو حبالۂ عقد میں لایا۔ جس کے بطن سے تین لڑکے شاہ شجاع۔ شاہ محمود اور شاہ احمد متولد ہوئے۔ ماں کی طرف سے شاہ شجاع قراختائیوں کا خون حاصل کر چکا تھا۔ ایلخانی سلطان ابوسعید سے امیرزادہ کا لقب اختیار کرنے کے بعد محمد مظفر نے یزد میں آبادکاری اور رفاہ عام کے کاموں کی طرف توجہ دی اور کئی عالیشان عمارتیں تعمیر کروائیں۔ کئی گاؤں اور قصبے آباد کئے جو اب تک اسی خاندان سے منسوب ہیں۔ مثلاً مبارز آباد۔ ترک آباد۔ شاہ آباد۔ مظفر آباد۔ علی آباد اور محمود آباد۔

۷۳۶ھ ہجری میں ایلخانیوں کا آخری حکمران ابوسعید فوت ہوا اور اس کے ساتھ اس خاندان کی طویل حکومت کا دور ختم ہوا۔ کیوں کہ اس کے جانشینوں میں کسی میں اس وسیع مملکت کو سنبھالنے کی لیاقت نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ایران میں طوائف الملوکی کا دور شروع ہوا تو امیر مبارز الدین نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر اپنی خود مختاری کا علم بلند کیا۔ اس وقت فارس کا علاقہ شاہ شرف الدین محمد اینجو کی اولاد کے ہاتھوں میں تھا اور وہ یزد اور کرمان پر حریصانہ نگاہیں ڈال رہے تھے۔ شرف الدین محمد کے

کو میں نے قاضی مجدالدین کی مجلس میں نہایت ادب اور احترام سے بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہ اپنے دونوں کانوں کو ہاتھ سے پکڑے ہوئے تھا۔ کسی بزرگ کے سامنے کان پکڑ کر بیٹھنا منگولوں اور ترکوں کے مراسم میں ادب اور احترام کی علامت ہے۔ آگے چل کر وہ کہتا ہے کہ میں مدرسہ مجدیہ میں گیا تو دیکھا دروازہ بند ہے۔ سبب پوچھنے پر معلوم ہوا کہ شاہ شیخ ابو اسحٰق کی والدہ تاش خاتون اور اس کی بہن ملک خاتون کے درمیان میراث کے متعلق اختلاف پیدا ہوا ہے۔ سلطان نے ان دونوں کو محاکمہ کی غرض سے قاضی مجدالدین کے پاس لایا اور اس نے شرع کے اصول کے مطابق فیصلہ دیا۔ ۷۵۴ھ میں امیر مبارزالدین نے اپنے وقت کے باشکوہ اور دانشمند آدمی خواجہ برہان الدین کو وزارت عظمیٰ سونپی۔ یہ برہان الدین ابونصر فتح اللہ خواجہ کمال الدین ابوالمعالی کا بیٹا تھا اور اس کا نسب نامہ خلیفہ سوم عثمان بن عفان سے جا ملتا ہے۔ اس شخص نے دس سال تک یزد میں وزیر اعظم کے فرائض انجام دیے۔ ۷۵۲ ہجری میں استعفیٰ دینے کے بعد ۷۵۶ ہجری میں دوبارہ اسی جلیل عہدہ پر مامور ہوا۔ اور چونکہ اسی سال قاضی مجدالدین اسمٰعیل کی وفات ہوئی اس لیے قاضی القضاۃ کا عہدہ وزارت عظمیٰ میں ضم کیا گیا۔ جس کی صدارت وہی کرتا رہا۔ لہٰذا اس کی اقامت گاہ شیراز ہی تھا۔ برہان الدین ۷۶۰ھ میں فوت ہوا۔

برہان الدین انصاف پروری اور داد و دہش کے لیے مشہور تھا۔ اس کی تعریف میں دیوان حافظ میں دو غزلیں ملتی ہیں جو غالباً بلکہ یقیناً ۷۵۶ اور ۷۶۰ ہجری کے درمیان کہی گئی ہیں۔ یہ دو غزلیں علامہ محمد قزوینی کے مرتبہ دیوان حافظ کے مطابق ملاحظہ کی جائیں تو معلوم ہوگا کہ پہلی غزل کے تیور قصیدہ کے سے ہیں نہ کہ غزل کے۔

۱ۓ دیدار شد میسر و بوس و کنار ہم — از بخت شکر دارم و از روزگار ہم

۲ۓ یا مبسما یحاکی درجا من اللآلی — یارب چہ در خور آمد گردش خط ہلالی

اسی قاضی مجدالدین کی وفات پر حافظ نے یہ قطعہ کہا ہے:

مجد دین سرور و سلطان قضات اسمٰعیل　　　که زدی کلک زبان آورش از شرع نطق

ناف هفته بُد و از ماه رجب کاف و الف　　　که برون رفت ازین خانهٔ بی نظم و نسق

کنف رحمت حق منزل او دان وانگه

سال تاریخ وفاتش طلب از رحمت حق

قاضی مجدالدین کو شیراز کے قاضیوں کے مشہور خاندان کا چشم و چراغ بتایا گیا ہے۔ صاحب شیراز نامہ لکھتا ہے کہ:

"شیراز کے امور شرع اور قضا کا منصب ڈیڑھ سو سال تک اسی خاندان کے سپرد رہا۔ قاضی مجدالدین کو اپنے زمانے کا نہایت خوش قسمت انسان خیال کرنا چاہئے، کیونکہ اُس نے ایک طرف شیخ سعدی کے ایام کو بھی دیکھا اور دوسری طرف حافظ کی زندگی کے کچھ ابتدائی حصہ کو بھی۔"

شیخ سعدی نے اس کے باپ قاضی رکن الدین کی مدح میں قصیدہ بھی کہا ہے اور شیخ سعدی کی وفات کے وقت قاضی مجدالدین کی عمر تیس برس کی تھی۔ کوئی تعجب نہیں کہ حافظ نے اسی قاضی مجدالدین کی زبان سے شیخ سعدی کے متعلق کچھ باتیں سنی ہوں۔ آٹھویں صدی ہجری کے مشہور سیاح ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ ۷۲۷ھ ہجری میں میرے شیراز جانے کا مقصد "الشیخ القاضی الایام، قطب الاولیا، فرید الدهر ذی الکرامات الظاهر مجدالدین اسمٰعیل بن محمد بن خداداد" کی ملاقات کا شرف حاصل کرنا تھا۔ ابن بطوطہ نے مدرسہ مجدیہ۔ محضر قضاوت اور قاضی مجدالدین سے تمیں شہر کے لوگوں کے احترام وغیرہ جیسی باتوں کی تفصیل بھی دی ہے۔ اس نے ۷۴۸ھ میں شیراز کا دوسرا سفر کیا جب کہ وہ ہندوستان سے جزیرۂ هرمز کی راہ سے واپس وطن جا رہا تھا۔ اس سفر کے دوران وہ لکھتا ہے کہ ایک دن شیخ ابو اسحاق اینجو

جد و جہد میں صرف کی گئی۔ جسمانی طاقت اور عمر کا ازالہ کرنے لگے۔ اگلے صفحوں میں تفصیل سے اس بات کا ذکر ہوگا کہ حافظ شاہ شیخ ابو اسحاق کے حلقۂ احباب میں شامل تھے۔ فی الحال اس امر کی طرف اشارہ کیا جائے گا کہ حافظ کا ایک قصیدہ اس مطلع کا ہے:

سپیدہ دم کہ صبا بوی لطف جان گیرد
چمن ز لطف ھوا نکتہ بر جنان گیرد

اس میں مندرج مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ نے یہ قصیدہ اُن دنوں کہا ہے جب شاہ شیخ ابو اسحاق مبارز الدین کے ہاتھوں پے در پے شکست کھانے کے بعد افسردہ اور دل سرد ہو چکا تھا۔ چنانچہ قصیدہ میں شاہ شیخ ابو اسحاق کی مدح کے ساتھ ساتھ اُس کی شکست کی علت بھی بتائی گئی ہے اور پیش آمدہ مصایب کو امتحان اور امتنان الٰہی بتایا ہے۔ فلسفیانہ انداز میں ناکامی کو صفائے قلب کے لیے ایک طرح کی ریاضت مانا ہے اور شاہ کو آیندہ وقت میں امیدوار رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ دشمن کی گستاخی کو عنقریب رسوائی اور خواری میں مبدل ہونے کی بشارت دی گئی ہے اور آخر کار شاہ ابو اسحاق کے لیے دعائے خیر مانگی گئی ہے اور عمر و دولت کو ایک آسمانی عطیہ کہہ کر ان کی دوام کی تمنّا کی گئی ہے۔

اس قصیدہ کی ایک خوبی یہ ہے کہ عام طور پر شاعر ممدوح کی فتح و نصرت پر زوردار قصیدہ لکھتا ہے اور اس لحاظ سے مضمون میں بڑی وسعت ملتی ہے لیکن اس صورت کے برعکس حافظ نے ممدوح کے شکست کھانے اور دل سرد ہونے کے موقعہ پر زیر نظر قصیدہ لکھا ہے۔ ظاہر ان کے سامنے اس لحاظ سے وسعت مضمون کی گنجائش نہیں۔ لیکن قصیدہ کا غور سے مطالعہ کرنے پر معلوم ہوگا کہ حافظ نے ممدوح کی شکست اور افسردگی پر غالب آنے کے لیے نئے اور تازہ مضامین پیدا کیے ہیں

امیر مبارزالدین کے دورِ حکومت کا مطالعہ کرتے ہوئے اُس کو قبائل کے ساتھ اکثر جنگ و جدل میں مشغول پایا جاتا ہے۔ یہ قبائل ھزارہ ۔ اوغانی اور جرمائی نام کے ہیں، جن کو ارغون خان کی حکومت کے دوران سلطان سیورغتمش کی التماس کرمان کے اطراف کی حفاظت کے لیے وہاں آباد کیا گیا تھا۔ رفتہ رفتہ ان کی تعداد اور قوت میں کافی اضافہ ہوا' اور باوجودیکہ امیر مبارزالدین کے ساتھ خون کا رشتہ رکھتے تھے' اُس کے خلاف بغاوت اور جنگ و جدل میں لگے رہے۔ یہ قبایل منگولوں کے طائفہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اپنے قبیلوں میں اصنام رکھتے اور ان کی تعظیم کرتے۔ اسی لیے علمائے اسلام نے ان کی تکفیر کا فتویٰ صادر کیا۔

امیر مبارزالدین ان کے ساتھ جنگ و جدل کو جہاد سمجھتا تھا اور اسی مناسبت سے اُسے "امیر غازی" کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ حافظ نے بھی اسی سلطان کو "شاہ غازی" کے لقب سے یاد کیا ہے جب اُس کی آنکھیں نکالی گئیں:

شاہ غازی خسرو گیتی ستان   آنکہ از شمشیر او خون می چکید

اور خواجوی کرمانی نے بھی ایک قصیدہ میں خسرو غازی کہا ہے:

خسرو غازی محمد حامی ملک عجم   سام کیخسرو حشم دارای افریدون حشم

شاہ شیخ ابو اسحاق اور امیر مبارزالدین کے درمیان بارہا مڈبھیڑ ہوتی رہی۔ مؤرخوں نے شاہ شیخ ابو اسحاق پر بار بار دوستی اور عہد و پیمان توڑنے کی تہمت لگائی ہے۔ چنانچہ اُن کے قول کے مطابق وہ سات بار نقض پیمان کا مرتکب ہو کر کرمان اور یزد پر چڑھائی کرتا رہا۔ بارہا اوغانی اور جرمائی قبایل کو اپنے ساتھ ملاتا رہا اور حیلہ و تدبیر سے امیر مبارزالدین کی قوت کو ختم کرنا چاہا، لیکن بار بار منہ کی کھانی پڑی۔ ہر بار اُس کے فوج سخت جانی اور مالی نقصان اُٹھاتے رہے، اور آخر کار شیراز میں عیش و طرب او لہو و لعب میں مشغول ہو کر طویل اور بے سود

جرمائی

نکال[1] شب که کند در قدح سیاهی مشک ‎ در او شرار چراغ سحر جهان گیرد

مشعشه سپهر چو زرین سپه کشد روزی ‎ به تیغ صبح و عمود افق جهان گیرد

برغم زال سیه شاهباز زرین بال ‎ درین مقرنس زنگاری آشیان گیرد

بنزهگاه چمن رو که خوش تماشائیست ‎ چو لاله کاسهٔ نسرین و ارغوان گیرد

چو شهسوار فلک بنگرد بجام صبوح ‎ که چون به شعشعهٔ مهر خاوران گیرد[2]

محیط[3] شمس کشد سوی خویش در خوشاب ‎ که تا به قبضهٔ شمشیر زرفشان گیرد

صبا نگر که دمادم چو رند شاهد باز ‎ گهی لب گل و گه زلف ضمیران گیرد

ز اتحاد هیولا و اختلاف صور ‎ خرد ز هر گل نو نقش صد بتان گیرد

من اندر آن که دم کیست این مبارک دم ‎ که وقت صبح درین خاکدان گیرد

چه حالتست که گل در سحر نماید روی ‎ چه آتشست که در مرغ صبح خوان گیرد

چه پرتوست که نور چراغ صبح دهد ‎ چه شعله است که در شمع آسمان گیرد

چرا به صد غم و حسرت سپهر دایره شکل ‎ مرا چو نقطهٔ پرگار در میان گیرد

ضمیر دل نگشایم بکس مرا آن به ‎ که روزگار غیورست و ناگهان گیرد

چو شمع هر که بافشای راز شد مشغول ‎ لبشش[4] زمانه چو مقراض در زبان گیرد

کجاست ساقی مهروی که از سر مهر ‎ چو چشم مست خودش ساغر گران گیرد

---

۱ — قزوینی اس بیت کے سمجھنے سے قاصر رہا ہے۔ اس کا قول ہے کہ ممکن ہے "نکال" دراصل "زگال" یعنی زغال" کی تصحیف ہے۔ (حاشیہ صفحہ تکہ)

۲ — بعض نسخوں میں مصرع یوں ہے۔۔ "که چون به شعشعه نور کحل جان گیرد

۳ — بعض نسخوں میں "بخط شمس"، مصرع کے معنی معلوم نہ ہو سکے۔

۴ — بعض نسخوں میں "لبش" اور بعض میں "سرش"۔

جو امید اور خوش دلی کی مژدہ رسانی کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے حافظ نے ایک طرح سعدی سے بڑھ کر جدّتِ فکر کا ثبوت دیا ہے۔

اس موضوع کو روشن کرنے کے لیے بہتر ہوگا کہ پورے قصیدے کو یہاں درج کیا جائے۔ ضمناً یہ بھی کہا جائے کہ حافظ پر آج تک صرف ایک غزل گو کی حیثیت سے بحث ہو چکی ہے۔ حالانکہ قصیدہ سرائی میں بھی اُنھوں نے بڑی مہارت اور زور کا ثبوت دیا ہے۔ اگرچہ ان کے دیوان میں صرف تین قصیدے موجود ہیں، جن میں بقول علامہ قزوینی، ظہیر فاریابی کا سبک ملتا ہے۔ کچھ اور نظمیں جنھیں غلطی سے غزل میں شامل کیا گیا ہے در اصل قصیدے ہیں۔ بہر حال زیر نظر قصیدہ درج ذیل ہے۔ اس پر محمد قزوینی نے بڑے فائدہ مند حاشیے لکھے ہیں۔ ضمناً یہ بھی کہا جائے کہ شیخ ابو اسحاق کا دور ۷۴۲ھ سے لے کر ۷۵۰ھ ہجری تک تھا۔ اس لحاظ سے یہ قصیدہ حافظ کے دورِ جوانی کے ابتدائی ایام اور ان کی شاعری کے اولین دور کا قصیدہ ہونا چاہیے۔ ممکن ہے کہ ہر تازہ وارد کی طرح حافظ نے اس قصیدہ میں عمداً تکلف اور تصنّع سے کام لیا ہو۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قصیدے میں کچھ ایسی معنوی اور لفظی تعقیدات پیدا ہو گئیں جن کی فہم مشکل ہے۔ چنانچہ شاہ منصور کی مدح میں جو قصیدے ہیں وہ اس وقت لکھے گئے ہیں جب کہ حافظ کی عمر پختہ ہو چکی تھی اور کلام میں بھی پختگی اور متانت آچکی تھی۔ لہذا اُن قصیدوں میں کوئی تعقید لفظی یا معنوی موجود نہیں۔ محمد قزوینی کا خیال ہے کہ زیرِ بحث قصیدے میں کئی ایسی قیدیں ہیں جو ممکن ہے کاتبوں کی تحریف کے نتیجہ میں نمودار ہوئی ہوں۔

سپیدہ دم کہ صبا بوی لطف جان گیرد
چمن ز لطف ہوا نکتہ بر جنان گیرد

ہوا ز نکہت گل در چمن تتق بندد
افق ز عکس شفق رنگ گلستان گیرد

نوای چنگ بہ آنسان زند صلای صبوح
کہ پیر صومعہ راہ در مغان گیرد

مدام درپی طعن است بر حسود و عداوت — سماک رامح ازان روز و شب سنان گیرد

فلک چو جلوه کنان بنگرد سمند ترا — کمینه پایگهش اوج کہکشان گیرد

ملاحتی که کشیدی سعادتی دعوت — که مشتری نسق کار خود ازان گیرد

از امتحان تو ایام را غرض آنست — که از صفای ریاضت دولت نشان گیرد

وگرنه پایۂ عزّت ازان بلندترست — که روزگار برو حرف امتحان گیرد

مذاق جانش ز تلخیٔ غم شود ایمن — کسی که شکّر شکر تو در دهان گیرد

ز عمر برخورد آنکس که در جمیع صفات — نخست بنگرد آنگه طریق آن گیرد

چو جای جنگ نبیند بجام یازد دست — چو وقت کار بود تیغ جان ستان گیرد

ز لطف غیب بسختی رخ از امید متاب — که مغز نغز مقام اندر استخوان گیرد

شکر کمال حلاوت پس از ریاضت یافت — نخست در شکن تنگ ازان مکان گیرد

در آن مقام که سیل حوادث از چپ و راست — چنان رسد که امان از میان کران گیرد

چه غم بود بهمه حال کوه ثابت را — که موجهای چنان قلزم گران گیرد

اگرچه خصم تو گستاخ میرود حالی — تو شاد باش که گستاخیش چنان گیرد

که هرچه در حق این خاندان دولت کرد — جزاش در زن و فرزند و خانمان گیرد

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۴:

۳؎ یعنی شرف الدین محمود شاہ اینجو۔ جمال الدین ابو اسحاق کا باپ۔

۴؎ تو اُمان سے مراد بُرج جوزا نہیں، کیونکہ اس کا کمربند نہیں ہوتا۔ اس لیے مراد برج جوزا کے جنوب میں صورت جبّار ہے۔ عرب اس کو مجازاً جوزا کہتے ہیں، اور اسی کے اردگرد نہایت خوبصورت دُرخشاں کمربند ہے۔ عرب اس کو نطاق الجوازا کہتے ہیں، یا منطقۃ الجوزا۔ جوزا کی یہی شرح حافظ کے اس مصرع کی ہے:

"جوزا سحر نہاد حمایل برابرم"۔

بیا می آورد از یار وو رپیش جامی | بشادی رُخ آن یار مہربان گیرد
نوای مجلس ما را جو بر کشد مطرب | گہی عراق زند گاہی اصفہان گیرد[1]
فرشتہ بحقیقت سروش عالم غیب | کہ روضۂ کرمش[2] نکتہ بر جنان گیرد
سکندری کہ مقیم حریم او چون خضر | ز فیض خاک درش عمر جاودان گیرد
جمال چہرۂ اسلام شیخ ابو اسحاق | کہ ملک در قدمش زیب بوستان گیرد
چراغ دیدہ محمود[3] آنکہ دشمن را | ز برق تیغ وی آتش بدودمان گیرد
باوج ماہ رسد موج خون چو تیغ کشد | بتیر چرخ برد حملہ چون کمان گیرد
عروس خاوری از شرم رای انور او | بجای خود بود ار راہ قیروان گیرد
ابا عظیم وقاری کہ ہر کہ بندۂ تست | ز رفع قدر کمربند تو امان گیرد[4]

۱؎ قزوینی کا خیال ہے کہ اس میں عراق اور اصفہان کو ایرانی موسیقی کی اصطلاحوں کے معنی میں نہیں لایا گیا ہے بلکہ اس میں اصفہان اور عراق کو فتح کرنے کا خفیف اشارہ بھی ہے۔ ملّا سودی نے بھی اس خفیف اشارے کو قابل قبول مانا ہے۔

۲؎ ملّا سودی کی شرح میں یہ بیت دیکھی نہیں گئی۔ سیاقِ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر "روضۂ اکرم ہی ہے تو یہ کسی باغ کا نام ہے۔ لیکن اگر "کرم" کے لغوی معنی لیے جائیں تو روضۂ کرم بمعنی روضۂ جوانمردی کچھ معنی نہیں دیتا۔ قزوینی کا خیال ہے کہ "کرم" دراصل لفظ "ارم" کی تصحیف سے ہوا ہے۔ پس "روضہ ارم" کی ترکیب زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ گمان ہے کہ شیراز میں شاہ شیخ ابو اسحاق کے بنوائے گئے باغ کا نام روضۂ ارم تھا یا کسی اور جگہ اس نام باغ تھا۔ حافظ کی ایک غزل میں "گلستان ارم" کی ترکیب آئی ہے:

در گلستان ارم دوش چو از لطف ہوا | زلف سنبل بہ نسیم سحری می آشفت
گفتم ای مسند جم جام جہان بینت کو | گفت افسوس کہ آن دولت بیدار بخفت

(دیوان با تصحیح قزوینی ص ۱۴۲)

(باقی حاشیے صفحہ ۱۶۵ پر)

مولانا ندکور کو بھی اس کام کے لیے مامور کیا۔ لیکن وہ مبارز الدین کو ابو اسحاق کی پیش کردہ شرائط کو قبول کرنے پر رضامند کرنے میں ناکام رہے۔

کہا جاتا ہے کہ جن ایام میں مولانا عضد الدین ایجی امیر مبارز الدین کی اردو گاہ میں صلح و آشتی کی کوششوں میں مصروف تھے، انہی دنوں شاہ شجاع نے مولانا عضد الدین کی مشہور تالیف "شرح مختصر ابن حاجب" کو اس کے پاس پڑھا۔ شاہ شجاع کو کسب علم کا بڑا شوق تھا۔ علم و ادب کا جو کچھ حصہ اسے نصیب ہوا تھا، وہ انہی مولانا عضد الدین کی صحبت اور اپنی غیر معمولی قوت حافظہ کی مدد سے ملا تھا۔ ورنہ وہ نہ تو کبھی باہتمام مکتب میں گیا تھا اور نہ کسی استاد کے پاس زانوئے ادب تہہ کیا تھا، اسی لیے حافظ نے ایک غزل میں اس کی ستائش کرتے ہوئے اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

نگار من کہ بہ مکتب نرفت و خط ننوشت
بغمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد

بہرحال مبارز الدین اور شاہ شیخ ابو اسحاق کے درمیان خصومت بڑھتی ہی گئی اور مبارز الدین کے دوسرے بیٹے شاہ شجاع اور ابو اسحاق کے درمیان پہلی مڈبھیڑ انہی ایام میں شوشترا اور شیراز کی شاہراہ پر واقع ہوئی، جب کہ امیر مبارز الدین نے شیراز کی مہم اپنے بیٹے کے سپرد کر دی تھی۔ اس زد و خورد میں ابو اسحاق کو پسپا ہونا پڑا، اور وہ مایوس ہو کر اصفہان کی طرف بھاگ نکلا۔ کرمان کی حکومت شاہ شجاع کو سپرد کر کے مبارز الدین خود اصفہان میں ہی رہا۔ ادھر شاہ شیخ ابو اسحاق کے ہوادار کازرون میں ایک بار پھر جمع ہوئے اور ان کی استعانت سے فائدہ اٹھا کر وہ شیراز پر حملہ آور ہوا۔ اعیان شہر کی ایک جماعت نے جو ابو اسحاق کی طرفداری کا دم بھرتی تھی، اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے دروازہ کازرون کو کھلوا دیا، اور

زمان عمر تو پاینده باد کاین نعمت   عطیه ایست که در کار انس و جان گیرد

۷۵۳ھ ہجری کے اواخر میں امیر مبارز الدین نے وقت کو اپنے دیرینہ حریف یعنی شاہ شیخ ابو اسحاق پر حملہ کرنے کے لیے مناسب خیال کیا، اور اسی غرض سے خود کرمان میں گرمسیر کی نواحی کی طرف چلا گیا اور اپنے بیٹے جلال الدین شاہ شجاع کو اپنا ولی عہد مقرر کیا۔ اس اقدام کی دلیل یہ تھی کہ شاہ شجاع ماں کی طرف سے قراختائی ترکوں کی نسل سے تھا جو کرمان پر حکمران تھے۔ گزشتہ اوراق میں اس طرف اشارہ ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ نے شاہ شجاع کو بعض اوقات "شاہِ ترکان" کے لقب سے یاد کیا ہے۔

شاه ترکان چو پسندید و به چاهم انداخت   دستگیر ار نشود لطف تهمتن چه کنم

سوختم در چاه صبر از بهر آن شمع چگل   شاه ترکان فارغست از حال ما کو رستمی

۷۵۴ھ ہجری میں امیر مبارز الدین بھاری لشکر لے کر فارس پر حملہ آور ہونے لگا۔ اس خبر سے شاہ شیخ ابو اسحاق فکر مند ہوا۔ درباریوں میں سے مولانا عضد الدین ایجی نے اُسے مبارز الدین کے ساتھ صلح کرنے کا مشورہ دیا۔ ابو اسحاق نے

۱؎ عجیب اتفاق ہے کہ مظفری خاندان کے تمام شہزادے اور شہزادیاں امیر تیمور کے حکم اصفہان کے نزدیک ماهیار نام کے گاؤں میں قتل کیے گئے اور اس خاندان کا نام و نشان تک مٹ گیا۔ یہ واقعہ ۷۹۵ھ ہجری میں رونما ہوا، اور حافظ کی پیشین گوئی درست نکلی۔

جو ۷۴۴ھ ہجری میں مکمل ہوئی تھی۔ اس میں عماد الدین کے بارے میں ایک جگہ مختصر سا ذکر ہوا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بڑے پایہ کا علم دوست اور فاضل شخص تھا۔

بہر حال خواجہ عماد الدین کے فتنہ کو ختم اور شیراز کے نظم و نسق کو بحال کرنے کے بعد شاہ شجاع نے اصفہان کا رُخ کیا اور اپنے باپ سے جا ملا۔ شیراز سے کچھ ہی فاصلے پر قہندز یا پہندز نام کے قلعہ کو بھی غارت کر دیا گیا جہاں شاہ شیخ ابو اسحاق کا دفینہ موجود تھا۔ امیر مبارز الدین اور اس کے بیٹے شاہ شجاع دونوں نے اصفہان کا محاصرہ کیا لیکن شدید زمستان کی وجہ سے انہیں واپس شیراز آنا پڑا۔ اگلے سال، سال کے محاصرے کے وقت ابو اسحاق لرستان اور پھر شوشتر کی طرف چلا گیا۔

۷۵۸ھ ہجری تک ان دو قدیم حریفوں کے درمیان اصفہان اور دیگر نواح میں جنگ و جدل ہوتی رہی اور آخر کار اسی سال اصفہان پر مظفریوں کا قبضہ ہوا۔ ان طویل محاصروں اور دھیڑوں کے دوران اصفہان کے لوگوں پر بڑی آفت نازل ہوئی اور وہ سراسیمگی سے دوچار ہوئے۔ اس آخری محاصرہ میں ابو اسحاق کو اصفہان سے فرار ہونے تک کی فرصت نہ ملی اور وہ شہر کے شیخ الاعظم اور مقتدی مولانا شیخ نظام الدین اصیل کے گھر میں روپوش ہوا۔ جاسوسوں نے اطلاع دی کہ ابو اسحاق اصفہان سے باہر جا نہیں سکا ہے اور شہر میں ہی کہیں چھپا ہوا ہے۔ صاحب "روضۃ الصفا"، کا کہنا ہے کہ جب مولانا نظام الدین اصیل کو یقین ہوا کہ آخر کار جاسوس ابو اسحاق کے اُس کے گھر میں روپوش ہونے کی اطلاع شاہ سلطان کو دیں گے تو وہ خود شاہ سلطان کے پاس گیا، اور اُس کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ شاہ سلطان کے کارندے مولانا کے گھر میں داخل ہوئے شاہ شیخ ابو اسحاق باورچیخانہ میں جا کر تنور میں چھپ گیا۔ لیکن پکڑا گیا، اور بڑی احتیاط کے ساتھ کہ مبادا اصفہان

ابو اسحاق کی فوج ایک بار پھر فاتحانہ انداز میں شیراز میں داخل ہوئی اور آلِ مظفر کے حامیوں کے قتل و غارت میں جُٹ گئی۔ شیراز کے محلہ موردستان کے لوگ شروع ہی سے مبارز الدین کے طرفدار تھے، ابو اسحاق نے اُن کے ساتھ سختی کی، اور اُن میں سے بہت سے لوگ عورتوں کا برقعہ اُوڑھ کر فرار ہونے لگے، یا دروازۂ کازرون کی طرف آ کر پناہ لینے لگے۔ صرف تین دن گزرے تھے کہ شاہ شجاع کی فوج شیراز کی نواحی میں آ پہنچی اور آخر کار شہر میں داخل ہوئی۔

دونوں فوجوں کے درمیان خونریز لڑائی ہوئی اور خاص کر دروازۂ کازرون کے رہنے والوں پر تو گویا آفت ناگہانی نازل ہوئی۔ قتل و غارت کا بازار اس قدر گرم ہوا کہ ڈیڑھ سال تک اس محلہ میں ایک بھی آدمی دکھائی نہ دیا۔ مطلع السعدین میں درج ہے کہ جو لوگ صبح کو عورتوں کا برقعہ پہن کر محلہ موردستان سے نکل کر محلہ کازرون میں آئے تھے شام کو وہی برقعے پہن کر واپس موردستان چلے گئے۔

شاہ شیخ ابو اسحاق کے وزیر خواجہ عماد الدین نے ابو اسحاق کے بھانجے امیر سلغر شاہ ترکمان سے مل کر جرمائی اور رادغائی قبائل سے مدد حاصل کر کے دارابجرد کے قریب بھاری لشکر کو جمع کیا اور شیراز کی طرف بڑھا، لیکن شاہ شجاع کی تابِ مقاومت نہ لا کر اُس کو پسپا ہونا پڑا۔ خواجہ عماد الدین کی مدح حافظ نے ایک غزل میں کی ہے، جو غالباً ابو اسحاق کی شکست سے پہلے کہی جا چکی تھی، ممکن ہے یہ غزل ۷۵۵ھ ہجری سے پہلے کی ہو، جب کہ حافظ کی عمر پچیس برس کے آس پاس کی تھی۔ مطلع یوں ہے:

کنوں کہ در چمن آمد گل از عدم بوجود
بنفشہ در قدم او نہاد سر بسجود

خواجہ عماد الدین کرمانی کے شرح احوال کے بارے میں کوئی اطلاع ہمارے پاس نہیں، البتہ "معیار جمالی" نام کی ایک کتاب شمس فخری کی تالیف ہے

یک کاسہ زہر است کہ مرگش خوانند   خوش درکش و جرعہ بر جہان ریز و برد

حافظ نے شاہ شیخ ابو اسحاق کی موت کے مادۂ تاریخ میں یہ قطعہ کہا ہے:

بلبل و سرو و سمن یاسمن و لالہ و گل

ہست تاریخ وفات شہ مشکین کاکل

خسرو روی زمین، غوث زمان بواسحاق

کہ بہ مہ طلعت او ناز دو خندید بہ گل

جمعہ بیست و دوم ماہ جمادی الاول

در پسین بود کہ پیوستہ شد از غنچہ بہ گل

"بلبل و سرو و سمن یاسمن و لالہ و گل" کے مصرع سے ۷۵۷ھ نکلتا ہے۔ جو در اصل حافظ ابرو کی بتائی ہوئی تاریخ ہے۔ اور "مطلع السعدین"، "روضۃ الصفا" اور "حبیب السیر" کے مطابق ۷۵۸ ہجری ہے۔ ایک سال کا فرق معلوم نہیں کیوں پڑا ہے۔ اور تعجب ہے کہ حافظ ہی کے ایک اور قطعہ میں مادۂ تاریخ کہا گیا ہے جس سے ۷۵۸ھ نکلتا ہے۔ قطعہ یوں ہے:

بروز کاف و الف از جمادی الاولیٰ

بسال ذال و دگر نون و حا علی الاطلاق

خدایگان سلاطین مشرق و مغرب

خدیو کشور عفو و کرم باستحقاق

سپہر حلم و حیا آفتاب جاہ و جلال

جمال دنیی و دین شاہ شیخ ابو اسحاق

میان عرصۂ میدان خود بہ تیغ عدو

نہاد بر دل احباب خویش داغ فراق

کے لوگ بلوہ کریں اصفہان کے مضبوط قلعہ طبرک میں محبوس کیا گیا۔ امیر مبارز الدین کی ہدایات کے مطابق اس کو فوجیوں کی حراست میں شیراز بھیجا گیا اور آخر کار میدان سعادت میں امیر مبارز الدین کے حکم سے قطب الدین ضرابی نے شمشیر کے دو وار سے اس کا سر تن سے الگ کر دیا۔

میدان سعادت شیراز کے دروازہ سعادت کے باہر ایک میدان ہے جس کو اسی شاہ شیخ ابو اسحاق نے بنوایا تھا۔ اس میں ایک محل بھی تعمیر کیا گیا تھا جس میں ابو اسحاق جلوہ افروز ہوا کرتا تھا۔ صاحب روضتہ الصفا نے لکھا ہے:

"....او را (ابو اسحاق) را از راہ مجہول بمیدان دروازہ استخر آوردند و در ہمان موضع کہ شادروان عظمت می افروخت افسر سلطنت بخاک انداختند۔"

اس مقولہ کی تصدیق حافظ ابرو کی "جغرافیائی تاریخی" سے بھی ہوتی ہے اور اس کے علاوہ حافظ کے اس قطعہ سے بھی جو ابو اسحاق کے قتل کے واقعہ میں کہا گیا ہے:

میان عرصہ میدان خود بہ تیغ عدو
نہاد بر دل احباب خویش داغ فراق

امیر جمال الدین شاہ شیخ ابو اسحاق کو ۷۵۸ھ ہجری میں جمعہ کے دن میدان سعادت میں قتل کر دیا گیا۔ اس وقت اس کی عمر ۳۷ برس کی تھی۔ وہ شعر و ادب سے بڑی دلچسپی رکھتا تھا اور قتل ہونے سے کچھ دیر پہلے یہ دو رباعیاں کہی تھیں:

۱۔ افسوس کہ مرغ عمر را دانہ نماند | امید بہ ہیچ خویش و بیگانہ نماند
دردا و دریغا کہ درین مدت عمر | از ہر چہ بگفتیم جز افسانہ نماند

۲۔ با چرخ ستیزہ کار مستیز و برو | با گردش دہر در میاویز و برو

ہے اور اس ضمن میں کئی دلچسپ حکایتیں بھی کہی ہیں۔ ان تذکرہ نویسوں میں حسن بن شہاب یزدی مؤلف جامع التواریخ حسینی۔ معین الدین یزدی مؤلف مواہب الٰہی اور محمود گیتی مؤلف تاریخ آل مظفر جیسے مستند مورخ شامل ہیں۔ شہاب الدین یزدی کی بتائی ہوئی ایک دو حکایات کو ہم یہاں پیش کرتے ہیں تاکہ اس سے حافظ کے ممدوح کی شخصیت کے کچھ نمایاں پہلو ہمارے سامنے آسکیں۔

(۱) ایک دن کسی نے ابو اسحاق کے سامنے حاتم طائی کی سخاوت کا ذکر کیا۔ اس نے پوچھا کہ حاتم کی کس قدر سخاوت تھی؟ جواب ملا کہ اس نے ایک محل بنوایا تھا۔ جس میں چالیس دریچے تھے۔ ایک دفعہ ایک سایل نے امتحان کے طور پر شیئاً للہ کہہ کر ایک دریچہ کھٹکھٹایا۔ حاتم نے ہر ایک دریچے سے تھوڑی تھوڑی رقم نیچے ڈلوا دی۔

یہ سن کر ابو اسحاق نے کہا کہ حاتم زیادہ سخی نہ تھا، اگر سخی ہوتا تو ایک ہی دریچہ سے اتنا روپیہ نیچے پھینکتا کہ اس گداگر کو چالیس جگہوں سے روپیہ اکٹھا کرنے کی زحمت اٹھانا نہ پڑتی۔

(۲) ایک بار سخت برفباری ہوئی۔ شاہ ابو اسحاق شکار کی غرض سے سوار ہوا۔ اس وقت بلبل کیکر نام کا ایک شخص وہاں حاضر تھا، اس نے یہ رباعی کہی:

شاہا فلکت بخسروی تعیین کرد ... وز مہر تو اسپ پادشاہی زین کرد
تا در حرکت سمند زرین رخ تو ... برگل ننہد پای زمین سیمین کرد

شاہ نے اپنے مرصع خنجر کو غلاف سے نکالا اور بلبل کیکر کے سامنے پھینکتے ہوئے حاضرین سے کہا، جو میرا وفادار ہے۔ اس کو کچھ دے۔ تھوڑی ہی دیر میں پچاس ہزار دینار جمع ہوئے۔

(۳) شیراز میں مسجد عتیق کے دروازے پر شاہ عاشق نام ایک شخص کی نقل

ہو سکتا ہے ناسخوں کی تحریف کے نتیجہ میں ان دو قطعوں میں ایک سال کا فرق پڑا ہو۔ چنانچہ برٹش میوزیم میں تاریخ جہاں آرائی غفاری کے حاشیہ پر قطعہ دوم مندکرہ بالا کا دوسرا مصرع یوں درج ہوا ہے :۔

"بسال ذال و دگر نون وزی علی الاطلاق"

۳- شاہ شیخ ابو اسحاق اینجو

شاہ ابو اسحاق حافظ کا ممدوح رہا ہے۔ یہ مرد فاضل اور علم دوست انسان بذل اور سخا میں یگانۂ عصر تھا۔ اور اہل فضل و ہنر کی ہمیشہ قدر دانی کرتا رہا۔ خوبرو اور خوش اندام ہونے کے علاوہ خوش اخلاق بھی تھا۔ اس کے زمانے میں فارس نعمت اور ثروت سے مالا مال اور لوگ آسودہ حال تھے۔ اس بادشاہ کی صفات کا ذکر اس کے مشہور ہمعصر شاعر عبید زاکانی نے ایک غزل میں بڑی خوبی سے بغیر مبالغہ کیا ہے۔ دراصل یہ غزل نہیں قصیدہ ہے، چنانچہ درج ذیل اشعار سے بخوبی روشن ہوگا۔

سلطان تاج بخش جہاندار امیر شیخ — کآوازہ سخاوت و جودش جہان گرفت

در عیش سازو عادت خسرو بنا نہاد — در عدل رسم شیوہ نوشیروان گرفت

پشتی دین بقوت تدبیر سپیر کرد — روی زمین بہ بازوی بخت جوان گرفت

ایوان و قصر و جنت و فردوس بر فراشت

بروی نشستہ شاد و قدح شادمان گرفت

ان تعریفوں کے بعد عبید زاکانی نے اس کی بدبختی اور نکبت کا پر سوز اشعار میں ذکر کیا ہے۔

اکثر تذکرہ نویسوں اور مورخوں نے ابو اسحاق کی داد و دہش کی تعریف کی

البتہ اس شیخ امین الدین کازرونی بلیانی کو خواجہ امین الدین جہرمی کے ساتھ خلط نہیں کرنا چاہیئے۔ خواجہ امین الدین جہرمی بھی شاہ شیخ ابواسحاق کا ندیم تھا اور عبید زاکانی نے اس کی بیوی کی ہجو میں کئی شنیع اشعار کہے تھے۔ عبید کی منتخب لطایف کے مقدمہ میں اس امین الدین جہرمی کے متعلق لکھا گیا ہے کہ:

"کہتے ہیں مولانا عبید کے زمانے میں جہان خاتون نام کی ایک بڑی ظریف اور حریف عورت تھی جو اس کے ساتھ مناظرہ، اور مشاعرہ کرتی تھی۔ ابواسحاق کے وزیر خواجہ امین الدین نے اس عورت کو اپنی بیوی بنانا چاہا۔ اس نے بڑے ناز و انداز کے بعد امین الدین کی منکوحہ بننا قبول کیا۔ اس ازدواج کے موقعہ پر عبید نے مندرجہ ذیل قطعہ لکھ کر بے محابا مجلس میں پڑھا اور وزیر نے بجائے سرزنش، اس کی نوازش کی!

وزیرا جہان قحبہ و بیوفاست — ترا از چنین قحبہ ای ننگ نیست
برو (....) فراخی دگر راہ بخواہ — خدای جہان را جہان تنگ نیست"

ان نامور شخصیتوں کے علاوہ خواجوی کرمانی اور حافظ بھی ابواسحاق کے زمانے کے نابغوں میں شامل ہیں، جو کسی نہ کسی طرح اس قدرشناس علم دوست بادشاہ کے فیض سے بہرہ ور تھے۔ ایک اور شخص جس نے شاہ شیخ ابواسحاق کی مدح میں کثرت سے شعر کہے ہیں، جلال الدین ابن عضد ایجی ہے۔ اس کا ایک قصیدہ اس مطلع کا ہے:

بہ صحن گلشن گیتی ز اعتدال بہار — صبا بساط زمرد فگند دیگر بار

ایک اور مدیحہ کے دو شعر یہ ہیں:

شاہ عادل شیخ ابواسحاق کز القاب او — آب حیوان شد روان باد شمال آمد پدید

اور قنادی کی دکان تھی۔ ایک دن جمعہ کی نماز کے بعد شاہ ابو اسحاق مسجد سے باہر آیا اور شاہ عاشق کی دکان پر بیٹھ کر کہا:

"من امروز دکاندار شاہ عاشقم۔ بیایید و از من نُقل بخرید۔"

حاضرین میں سے ہر ایک نے مرصع خنجر۔ شمشیر بند۔ زرِ خالص یا مسکوات جو کچھ پاس تھا پیش کیا، اور شاہ نے ہر چیز کے عوض میں مٹھی بھر شیرینی دی تھوڑی ہی دیر میں ایک لاکھ دینار نقد اور جنس اکٹھا ہوئے۔

جب شاہ چلا گیا، تو شاہ عاشق دکاندار نے اپنی دُکان پر کھڑے ہو کر پکارا:

"اے شیراز کے لوگو! بادشاہ نے مجھے بڑی نعمت سے نوازا ہے۔ میں یہ نعمت اُس کے سر کے صدقے آپ کو بخشتا ہوں۔ آؤ۔ اور میری دکان لُوٹ لو۔"

یک لخت لوگ آئے اور دُکان لوٹ لیا۔ جب ابو اسحاق کو یہ خبر ملی تو اُس نے کہا کہ شاہ عاشق مجھ سے زیادہ کریم ہے۔

چونکہ ابو اسحاق علم دوست اور شعر فہم بادشاہ تھا، اِس بنا پر عالموں۔ ادیبوں اور شاعروں کی ایک جماعت اُس کے دربار سے تعلق رکھتی تھی۔ ان میں عبید زاکانی۔ شمس فخری اصفہانی (صاحب معیار جمالی و مفتاح ابو اسحاقی) قاضی عضد ایجی (صاحب کتاب مواقف)، اور امیر امین الدین کازرونی بلیانی) جیسے لوگ شامل تھے۔ موخر الذکر اپنے وقت کا بڑا عارف تھا، جس کے مریدوں میں خواجوی کرمانی بھی شامل تھا۔ چنانچہ خواجو نے اسی امین الدین کی ستائش اپنی مثنوی "گل نوروز" میں کھل کر کی ہے۔ یہ وہی امین الدین ہے جس کا نام حافظ نے ایک قطعہ میں ابو اسحاق کے زمانے کے پانچ مشہور شخصیتوں میں شامل کیا ہے یعنی:

دگر بقیہ ابدال شیخ امین الدین

کہ یمن ہمت او کارہای بستہ گشاد

لیکن شاہ شیخ ابو اسحاق کے معاصرین میں سب سے بڑا اور ایران کے آسمان ادب کا ہی نہیں بلکہ آسمان ادب جہان کا ایک درخشندہ ترین ستارہ حافظ شیرازی ہے۔ اگر ابو اسحاق اور آل مظفر و آل جلایر و ملوک ھرمز وغیرہ کو حافظ کے ہمعصر ہونے کا فخر حاصل نہ ہوتا اور اگر اُن کے اشعار میں ضمناً ان بادشاہوں اور شاہزادوں کا ذکر نہ آیا ہوا ہوتا تو شاید اس دور کی تاریخ کے بارے میں ہم اتنا غور و خوض ہی نہیں کرتے کیونکہ ہر صدی میں ایسے سینکڑوں سلطان اور شہزادے ملکوں کے اطراف میں اُبھرتے ہیں جو ستارہ سحری کی طرح تھوڑی دیر چمک کر ناپید ہو جاتے ہیں۔ ان کی تاریخ میں تحقیق تضیع اوقات سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔ حافظ نے ابو اسحاق کے عہدِ حکومت کی تعریف اور خود شاہ کی توصیف میں ایک قصیدہ کہا ہے۔

سپیدہ دم کہ صبا بوی لطف جان گیرد
چمن ز لطف ہوا نکتہ بر جنان گیرد

دو قطعے جو حافظ نے ابو اسحاق کی وفات میں کہے ہیں، اس سے پہلے درج ہو چکے۔ ایک غزل جسے دراصل رثا یہ کہنا چاہئے۔ حافظ نے ابو اسحاق کے زمانے کے بعد جور و جفا اور اس کی سلطنت کے غیر متوقع خاتمہ کے بارے میں بڑے سوز و گداز سے کہی ہے:

یاد باد آنکہ سر کوی تو ام منزل بود	دیدہ را روشنی از خاک درت حاصل بود
راست چون سوسن و گل از اثر صحبت پاک	بر زبان بود مرا آنچہ ترا در دل بود
دل چو از پیر خرد نقل معانی میکرد	عشق میگفت بشرح آنچہ برو مشکل بود
آہ از آن جور و تطاول کہ درین دامگہ است	آہ از آن سوز و نیازی کہ در آن محفل بود
در دلم بود کہ بی دوست نباشم ہرگز	چہ توان کرد کہ سعی من و دل باطل بود
دوش بر یاد حریفان بخرابات شدم	خم می دیدم و خون در دل و پا در گل بود
بس بگشتم کہ بپرسم سبب درد و فراق	مفتی عقل درین مسئلہ لا یعقل بود

خسروِ گیتی ستان کز نوبہار عدل او　　در مزاج چار عنصر اعتدال آمد پدید

جلال الدین عضدی کا شاہ ابواسحاق کی مدح میں ایک اور پرزور قصیدہ خاقانی کے ایک مشہور قصیدہ کی زمین میں موجود ہے:

پیش ازین کاین چار طاق ہفت منظر کردہ اند

وز فروغِ مہر عالم را منوّر کردہ اند

ابواسحاق کے ہمعصر فضلا میں دو تین کے نام قابل ذکر ہیں۔ مثلاً (۱) ابوالعباس احمد ابی الخیر زرکوبی جو شیراز نامہ کا مؤلف ہے۔ زرکوبی نے خود کہا ہے شیراز نامہ کی پہلی جلد خاندان اینجو اور خاص کر شاہ ابواسحاق کی تاریخ سے متعلق ہے یہ حصہ اب نابود ہے۔

(۲) محمد بن داؤد آملی۔ اُس نے "نفایس الفنون فی عرایس العیون" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو علوم و فنون کے مختلف شعبوں یعنی معقول و منقول و فروع و اصول وغیرہ کے بارے میں لکھی گئی تھی اور شاہ ابواسحاق کے نام سے معنون کی گئی تھی۔

(۳) جلال الدین فریدون عکاشہ۔ یہ شخص اُس زمانے کا مشہور دبیر اور مترسل اور خاندان اینجو کا درباری منشی تھا۔ وہ شاہ ابواسحاق کا ندیم بھی تھا۔ اس کی منشآت کا مجموعہ کتاب خانہ مجلس شوری ملّی ایران کے علاوہ اصفہان کے کتابخانہ شہرداری میں مجموعہ تاج الدین احمد وزیر میں موجود ہے۔ تہران میں حاج سید نصراللہ تقوی کے ذاتی کتابخانہ میں بھی اس کا نسخہ موجود ہے۔

(۴) عبید زاکانی۔ اس کا ایک منظومہ "عشاق نامہ" اسی ابواسحاق کے نام سے معنون کیا گیا۔

عباس اقبال نے اپنے زیر اہتمام چھاپے گئے کلیات عبید زاکانی میں تقریباً بتیس[۲] قصیدے۔ ایک ترکیب بند اور ایک مرثیہ کا روئے سخن شاہ شیخ ابواسحاق کی طرف بتایا ہے۔

ابتدا ہیں نظامی کے شعر سے ہوا ہے، جس میں کاتبوں نے تحریف کر کے نوشجانی کی جگہ "بواسحاقی" لکھ دیا اور پھر لوگوں نے خیال کیا کہ ایک کان کا نام ہے جو بو سحاق سے منسوب ہے۔ چنانچہ نظامی گنجوی کا شعر یوں ہے ؎

به فیروزه ای نوشجانیش داد
سخن بین که در نوشجانی فتاد

استاد مرحوم کا کہنا ہے کہ فیروزۂ نوشجانی ایک گہرے نیلے رنگ کا ہیرا ہوتا ہے جس کی تشبیہ اوّل شب کی نیلی اور سیاہی مائل تاریکی سے دی گئی ہے۔ حافظ کے شعر میں "خاتم فیروزہ بواسحاقی نام کی کان کے فیروزہ کی انگوٹھی کا نگینہ ہے"[۱]

اصفہان کے ادارۂ آثار قدیمہ کے سابق ناظم مجد زادہ صہبا کے پاس دیوان حافظ کا ایک قلمی نسخہ ہے۔ اس پر کتابت کی تاریخ تو کہیں درج نہیں، لیکن خط کی روش اور اس کے کاغذ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ نسخہ ایک ہزار صدی ہجری کے آس پاس کی کتابت کا ہے۔ اس کی ایک غزل میں ایک شعر ہے جو صریحاً شاہ اسحاق کی مدح میں کہا گیا ہے۔ یہ شعر دیوان حافظ کے باقی نسخوں میں دیکھا نہیں گیا۔ ممکن ہے چونکہ آخر کار مظفریوں کے ہاتھوں شاہ شیخ ابو اسحاق کا خاتمہ ہوا اس لیے حافظ نے احتیاط کے طور پر اس شعر کو اپنی غزل سے نکالا ہو۔ غزل کا مطلع یہ ہے:

پیش از نیست بیش ازین غم خواری عشاق بود
مہر ورزی تو با ما شہرۂ آفاق بود

اور شعر زیر نظر یوں ہے:

پیش ازین کاین نہ رواق چرخ اخضر بر کشند
دور شاہ کامگار و عہد بواسحاق بود

---

[۱] در مکتب استاد - از برنامہ ہای رادیو ایران صفحہ ۲۰۸-۲۰۹)

راستی خاتم فیروزہ بواسحاق خوش درخشید ولی دولت مستعجل بود
دیدی آن قہقہۂ کبک خراماں ایدل
کہ ز سرپنجۂ شاہین قضا غافل بود

مقطع سے پہلے کا شعر بڑا معنی خیز ہے اور ہمارے مقصد کی پوری وضاحت کرتا ہے۔
البتہ "فیروزہ بواسحاقی" کے متعلق ہماری تحقیق کے بعد دو متضاد رائیں سامنے آتی ہیں
پہلی رائے یہ ہے کہ یہ ایک قسم کا فیروزہ تھا۔ چنانچہ برہان قاطع میں اسکے
معنی یوں آئے ہیں ــ "نیشاپور میں فیروزہ کی کچھ کانیں ہیں جن میں سے ایک کو "بو
اسحاقی" کہتے ہیں۔ فیروز اللغات میں یہ عبارت دیکھی گئی " بواسحاقی فیروزہ کی
ایک کان نیشاپور کے نزدیک ہے، اور بواسحاق سے منسوب ہے"۔ ابوریحان
بیرونی (البیرونی) نے اپنی کتاب "الجماہر فی معرفۃ الجواہر" میں "ذکر الفیروزج"
عنوان کے تحت لکھا ہے:

"..... والمختار منہ ما کان من المعدن الازہری
والبوسحاقی۔ (صفحہ ۱۷۰ طبع حیدر آباد، دکن)

صاحب مطلع السعدین نے ۷۵۴ ہجری کے وقایع کے تحت لکھا ہے کہ امیر مبارز الدین
مظفر نے جب شیراز کے لشکر کو شکست دی تو تخت گاہ سلیمان یعنی فارس کی تسخیر کا
ارادہ کیا اور "کان فیروزہ بواسحاقی" کو کھودنے کا مصمم ارادہ کیا"۔

خواندمیر نے دستور الوزرا میں شاہ شیخ ابواسحاق کے شرح احوال کے آخر میں
حافظ کا متذکرہ بالا شعر لایا ہے۔ اُستاد علی اصغر حکمت نے درج بالا آراء سے
اتفاق کیا ہے۔

دوسری رائے جو پہلی سے بالکل مختلف ہے، میرے اُستاد مرحوم سعید نفیسی
کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بواسحاقی نام کی کوئی فیروزہ کی کان نہیں۔ یہ اشتباہ

جس کا اشارہ واضح طور پر شاہ شیخ ابو اسحاق کی طرف ہے۔ کیونکہ صرف وہی ایک بادشاہ ہے جو حافظ کے زمانے میں فارس (شیراز) میں مارا گیا تھا۔

۳۔ یاری اندر کس نمی بینیم یاران را چہ شد
دوستی آخر کی آمد دوستداران چہ شد

۴۔ دی پیر مے فروش کہ ذکرش بخیر
گفتا شراب نوش و غم دل ببر ز یاد

یہ تو مسلّم ہے کہ حافظ کی بہت سی غزلوں میں ممدوح کا نام لیے بغیر اس کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے، لیکن ہمارے پاس کوئی ٹھوس دلیل نہیں جس کی بنا پہ کہا جائے کہ ایسے اشعار صرف شاہ شیخ ابو اسحاق ہی سے منسوب ہیں۔ حافظ کے دیوان میں ایک سو پچاس سے زیادہ موقعوں پر شاہ۔ بادشاہ۔ خسرو۔ شاہنشاہ۔ سلطان وغیرہ الفاظ لائے گئے ہیں۔ اس لیے ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ حافظ کا اشارہ کس بادشاہ کی طرف ہے، البتہ اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ مندرجہ ذیل میں سے کسی ایک کی طرف ہو سکتا ہے جو اس کے ہمعصر تھے:۔

جلال الدین مسعود شاہ اینجو۔ شاہ غیاث الدین کیخسرو۔ شاہ شیخ ابو اسحاق۔ امیر مبارز الدین مظفر۔ شاہ شجاع۔ شاہ زین العابدین۔ شاہ یحییٰ۔ سلطان عماد الدین احمد۔ شاہ محمود۔ سلطان اویس ایلکانی۔ سلطان احمد ایلکانی۔ قطب الدین تہمتن وغیرہ وغیرہ۔

یہ نکتہ بڑی حد تک معقول ہے کہ جب ایسی کسی غزل میں جس میں کسی شاہ کی طرف اشارہ ہو، غور کیا جائے تو قرائن سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مندرجہ بالا میں سے کس شاہ سے اس کا تعلق ہو سکتا ہے۔

متذکرہ بالا غزلوں اور قطعوں کے علاوہ اور بھی کئی غزلیں ہیں جن کے بارے میں قرائن کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ ان کا اشارہ بھی شاہ شیخ ابو اسحاق ہی کی طرف ہو سکتا ہے۔ وہ اس فراخ دِل پادشاہ کے عہد کی خوشحالی اور آسودگی کی آئینہ دار ہیں۔ ہم اگلے صفحوں میں اس پر اور روشنی ڈالیں گے۔ یہاں اتنا کہنا لازمی ہوگا کہ حافظ نے بڑی ہی ہنرمندی کے ساتھ ان غزلوں میں تاریخی اور اجتماعی اوضاع کو شاعرانہ رنگ آمیزی کے ساتھ رمز اور کنایہ میں پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل مطلع کی غزلیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ یاد باد آنکہ نہانت نظری با ما بود　　رقم مہر تو بر چہرہ ما پیدا بود

مضمون اور اندازِ بیان سے یہ غزل سابق الذکر غزل یعنی "یاد باد آنکہ سر کوی توام منزل بود" کے ساتھ بڑی مشابہت رکھتی ہے۔ اس لیے واضح ہے کہ شاہ شیخ ابو اسحاق ہی سے مخاطب ہو کر کہی گئی ہوگی۔ علاوہ ازیں اس غزل کے ساتویں شعر میں "کمر بستی" کی ترکیب آئی ہے ایران کے بادشاہوں کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ کمر باندھا کرتے تھے، علاوہ ازیں اس کے ساتھ مصرع دوم میں "در رکابش مہ نو پیک" سے ہماری رائے کو اور بھی تقویت ملتی ہے۔

۲۔ دمی با غم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد
بمی بفروش دلق ما کزین بہتر نمی ارزد

اس غزل کے بارے میں محققوں کا خیال ہے کہ یہ ہندوستان کے محمود شاہ بہمنی۔ سلطانِ دکن کو بھیجی گئی تھی۔ اس ضمن میں ہم گزشتہ اوراق میں کئی باتوں کا اعادہ کر چکے ہیں۔ قرائن و شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس غزل کا محرک دراصل شاہ شیخ ابو اسحاق کی سیاہ بختی تھی، خاص کر یہ شعر:

شکوہ تاج سلطانی کہ بیم جان درو درج است　　کلاہی دلکشست اما بدردسر نمی ارزد

یہ شعر پڑھا:

بیا کہ یک امشب تماشا کنیم   چو فردا شود کار فردا کنیم

شاہ شیخ ابو اسحاق کے دورِ حکومت اور امیر مبارز الدین کے ذریعہ شیراز کے محاصرہ کے وقت یعنی ۷۵۴ھ ہجری میں ایک بڑا واقعہ رونما ہوا، اور وہ فارس کے اکابر میں سب سے معظم اور معروف شخص حاجی قوام الدین حسن کی موت ہے۔ تمام مؤرخوں نے ایران کے اس دریا دل بزرگ منش آدمی کی بہت تعریف کی ہے اور حافظ نے بھی ایک غزل کے ایک شعر میں اس کے کرم و سخا کی صفتوں کو سراہا ہے:

دریای اخضر فلک و کشتیِ ہلال

ہستند غرقِ نعمتِ حاجی قوام ما

حاجی قوام سے متعلق کچھ معلومات ہم سابقہ اوراق میں بیان کر چکے ہیں اور اس کا اعادہ غیر ضروری ہے۔ کئی مؤرخوں کا خیال ہے کہ شیخ شاہ ابو اسحاق کی بدبختی کی ایک وجہ حاجی قوام کی بے وقت موت ہے، کیونکہ اگر وہ محاصرہ کے وقت زندہ ہوتا، تو اپنے اثر و رسوخ اور حسن تدبیر کی بنا پر ممکن تھا، امیر مبارز الدین کے ساتھ معاملہ کو سلجھا لیتا، کیونکہ اس سے پہلے بھی ایک بار شاہ شیخ ابو اسحاق پر جب دشمن غالب ہونے والا تھا تو اسی قوام الدین نے کہا تھا — "تا من زندہ باشم، ہیچ باکی نداشتہ باش"۔

ابو اسحاق کے قتل کے بعد امیر مبارز الدین فارس، عراق، یزد اور کرمان کا خود مختار اور بلا حریف بادشاہ بنا اور اس کے ساتھ ہی آذربائیجان کی تسخیر کا منصوبہ بناتا رہا۔ اس مہم میں اس کے بیٹے شاہ شجاع، بھتیجے شاہ سلطان اور کمسن پوتے شاہ یحییٰ کا بھی ہاتھ تھا۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ شیراز شاہ شجاع کے ہاتھوں اور اصفہان شاہ سلطان کے ہاتھوں سر ہو چکے تھے۔ آذربائیجان پر امیر مبارز الدین کی لشکر کشی کے

اگرچہ خاندان انجو میں صرف شاہ شیخ ابو اسحاق ہی ایک ایسا بادشاہ تھا جس نے اپنی ذاتی قابلیت کا ثبوت دیا اور فتح شیراز کے دوران امیر حسن چوپان کا مقابلہ کرنے میں دلیری کا ثبوت دیا، لیکن اس کے باوجود وہ کئی بڑی غلطیوں کا مرتکب ہوا جن میں سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ وہ بار بار بے ہودہ اور احمقانہ جنگوں میں اپنے آپ کو اُلجھایا کرتا تھا۔ چنانچہ حافظ نے اس کے قصیدہ میں ایک شعر میں اس طرف خفیف سا اشارہ کیا ہے :۔

زعمر بر خورد آنکس کہ در جمیع صفات
نخست بنگرد آنگہ طریق آن گیرد

وہ نہ صرف بدگمان اور کم احتیاط آدمی تھا، بلکہ اس قدر عیاش اور آرام طلب تھا کہ شیراز کے محاصرے کے وقت بھی مجلس عیش و نشاط جمائے بیٹھا رہتا۔ دولت شاہ سمرقندی نے اپنے تذکرہ میں اس ضمن میں ایک دلچسپ حکایت بھی لکھی ہے:۔

ایک بار امیر مبارز الدین بھاری لشکر لے کر یزد سے شیراز کی طرف چل پڑا۔ شیخ ابو اسحاق عیش و طرب میں مشغول تھا۔ اُسے اطلاع دی گئی کہ دشمن آرہا ہے۔ حکم دیا کہ مجھے اس بارے میں کوئی کچھ نہ کہے۔ آخر کار دشمن شہر کے دروازے پر آپہنچا۔ لیکن کسی شخص میں جرأت نہ ہوئی کہ یہ خبر بادشاہ تک پہنچا سکے۔ امین الدین بادشاہ کا مقرب اور ندیم تھا۔ ایک دن اُس نے بادشاہ کو اپنے محل کی چھت پر آنے کی دعوت دی، تاکہ شیراز کی بہار میں گلزار اور سبزہ زار کا نظارہ دیکھے۔ بادشاہ نے چھت پر آکر ادھر اُدھر نظر دوڑائی۔ دیکھا ایک عظیم لشکر شہر کے باہر ڈیرا ڈالے ہوئے ہے۔ پوچھا یہ کیا ہے؟ وزیر نے جواب دیا کہ امیر مبارز الدین شیراز پر حملہ کرنے کی غرض سے آیا ہے۔ شاہ ابو اسحاق مسکرایا اور کہا، عجب بے وقوف آدمی ہے۔ اِس موسم نوبہار میں اپنے آپ کو بھی، اور ہمیں بھی عیش اور خوشدلی سے محروم کرنا چاہتا ہے، اور شاہنامہ کا

منجّم کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی۔ سلمان ساوجی نے امیر مبارز الدین کی اپنے بیٹے کے ہاتھوں گرفتاری کے ضمن میں کچھ شعر کہے ہیں:-

آنکہ از کبریک وجب می دید   از سرش تا بہ افسر ہور

آنکہ میگفت کہ شترزہ شیر منم   روزھیجا و دیگران ہمہ گور

قوۃ الظہر پشت او شکست   قرہ العین کرد چشمش کور

اِس میں کوئی شک نہیں کہ حافظ مبارز الدین کو اپنے ولی نعمت ابواسحاق کا قاتل ہونے کے علاوہ عوام کے اخلاق کو فاسد بنانے اور ریاکاری اور خرافات کے بازار کو گرم کرنے کے لیے ذمہ دار سمجھتے تھے، اس بنا پر اُس کے ساتھ نفرت بھی کرتے تھے ظاہر ہے اس حادثے نے حافظ کے ذہن اور روح کو عذاب پہنچایا ہوگا۔ حافظ نے بیشک امیر مبارز الدین کو اربابِ ذوق کا مزاحم سمجھا ہوگا، اور ہم جانتے ہیں کہ یہاں بھی ہوسکا اُس نے رمز و کنایہ میں مبارز الدین کی بُرائی کی۔ یہ بھی درست ہے کہ اگر مبارز الدین شاہ شجاع کا باپ نہ ہوتا تو عین ممکن تھا کہ حافظ اعلانیہ اس کی عیب جوئی کرتے اور اس کو بُرا بھلا کہتے۔

مندرجہ ذیل غزل کے بارے میں اکثر کہا جاتا ہے کہ یہ اُس وقت کہی گئی ہے جب امیر مبارز الدین کا تنزل اور شاہ شجاع کے دَور حکومت کا آغاز ہوا تھا۔ اِس غزل اور اس طرح کی کئی اور غزلوں سے حافظ کی اُس خوشی کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے جو ریاکاروں اور متظاہروں کی بناوٹی دین داری کے خاتمہ اور اہلِ ذوق اور وجدان کی آزادی کے مواقع میسّر ہونے پر حاصل ہوئی تھی، اس ضمن میں ہم درج ذیل غزل کی طرف خصوصیت سے اشارہ کریں گے۔

سحر ز ہاتف غیبم رسید مژدہ بگوش   کہ دَورِ شاہ شجاع است می دلیر بنوش

واقعات کو یہاں نظر انداز کیا جاتا ہے کیونکہ اس کے ساتھ ہماری تحقیق کا کوئی سروکار نہیں۔ امیر مبارز الدین کا انجام نہایت عبرتناک تھا۔ وہ بد خو، غضبناک اور سفاک آدمی ہمیشہ گالی گلوچ اور بد کلامی سے کام لیتا تھا، انھی بری اور قبیح عادتوں کی بنا پر اس کے دونوں بیٹے شاہ شجاع اور شاہ محمود اس سے بدظن ہو گئے۔

امیر مبارز الدین اصفہان میں تھا تو شاہ شجاع نے اپنے بھائی سے اس کی بری خصلت کا ذکر کیا اور یہ مشورہ دیا کہ اس کو قید کر کے یا تو اندھا بنایا جائے یا قتل کیا جائے شاہ شجاع نے یہ الزام تراشا کہ مبارز الدین نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کو ولی عہد بنانے کی ٹھانی ہے۔ دو بھائیوں کی باہمی سازش کامیاب ہوئی اور امیر مبارز الدین اپنے بیٹے شاہ شجاع کے ہاتھوں ڈرامائی انداز میں گرفتار ہوا۔ محمود گیتی کا کہنا ہے کہ طلوع آفتاب کے وقت مبارز الدین اپنے کمرے میں قرآن پڑھ رہا تھا اور مولانا رکن الدین ھراتی کے علاوہ دوسرا کوئی شخص وہاں موجود نہیں تھا۔ شاہ شجاع نے چھ قوی ہیکل پہلوانوں کو اسے گرفتار کرنے کے لیے بھیجا۔ انھوں نے مبارز الدین کو اپنی تلوار سنبھالنے کی بھی فرصت نہ دی۔ مولانا رکن الدین نے چھلانگ ماری اور شاہ شجاع کے سامنے سے اس کو پہچانے بغیر گالیاں دیتے ہوئے گزرا۔ شاہ شجاع نے اس پر تلوار کی ایک ضرب لگائی اور وہ نڈھال ہو کر گر پڑا۔

جامع التواریخ میں درج ہے کہ جن دنوں امیر مبارز الدین تبریز پر چڑھائی کر رہا تھا، ایک دن اچانک سلطان جلایری کے لشکر کی آمد کی اطلاع ملی۔ مبارز الدین کو علم نجوم پر اعتقاد تھا، اور کسی منجم نے اسے کہا تھا کہ ایک نوجوان۔ قد بلند — ترک زادے کے ہاتھوں اسے مصیبت اٹھانا پڑے گی۔ سمجھا کہ شاید اویس جلایری ہی وہ جوان ہے جس کی طرف منجموں نے اشارہ کیا تھا۔ فوراً اصفہان کی طرف چل پڑا۔ راستے میں کہیں بھی توقف نہیں کیا، لیکن اصفہان پہنچنے پر اپنے ہی بیٹے کے ہاتھوں قید ہو۔ اس طرح غالباً

بیار بادهٔ رنگین که یک حکایت راست
بگویم و بکنم رخنه در مسلمانی

بخاک پاک صبوحی کنان که تا من مست
ستاده بر در میخانه ام بدربانی

بهیچ زاهد ظاهر پرست نگذشتم
که زیر خرقه نه زنار داشت پنهانی

بنام طرّهٔ دلبند خویش خیری کن
که تا خداش نگهدارد از پریشانی

مگیر چشم عنایت ز حال حافظ باز
دگر نه حال بگویم بآصف ثانی

وزیر شاه نشان خواجهٔ زمین و زمان
که خرّم است بدو حال انسی و جانی

قوام دولت و دینی محمد بن علی
که میدرخشدش از چهره فرّ یزدانی

زهی حمیده خصالی که گاه فکر صواب
ترا رسد که کنی دعوی جهانبانی

طراز دولت باقی ترا همی زیبد
که همتت نبرد نام عالم فانی

اگر نه گنج عطای تو دستگیر شود
همه بسیط زمین رو نهد بویرانی

ترا که صورت جسم تراهیولائیست
چه جوهر ملکی در لباس انسانی

کدام پایهٔ تعظیم نصب شاید کرد
که در مسالک فکرت نه برتر از آنی

درون خلوت کرّوبیان عالم قدس
صریر کلک تو باشد سماع روحانی

ترا رسد شکر آویز خواجگی که بود
که آستین بکریمان عالم افشانی

صواعق سخطت را چگونه شرح دهم
نعوذ بالله ازان فتنهای طوفانی

سوابق کرمت را بیان چگونه کنم
تبارک الله ازان کارساز ربانی

کنونکه شاهد گل را بجلوه گاه چمن
بجز نسیم صبا نیست همدم جانی

شقایق از پی سلطان گل سپارد باز
بباد بان صبا کلّهای نعمانی

بران رسید ز سعی نسیم باد بهار
که لاله میزند از لطف روح حیوانی

سحرگهم چه خوش آمد که بلبلی گلبانگ
بغنچه میزد و گفت در سخن رانی

که تنگدل چه نشینی ز پرده بیرون آی
که در خمست شرابی چو لعل رمانی

شد آنکه اہلِ نظر برکرانہ می افتند — ہزار گونہ سخن در دہان و لب خاموش

بصوت چنگ بگوئیم آن حکایت ہا — کہ از نہفتن آن دیگ سینہ میزد جوش

شراب خانگی ترس محتسب خوردہ — بروی یار بنوشیم و بانگ نوشانوش

زکوی میکدہ دوشش بدوش می بردند — امام شہر کہ سجادہ میکشید بدوش

دلا دلالت خیرت کنم براہ نجات — مکن بہ فسق مباہات و زہد ہم مفروش

محلِ نور تجلی ست رای انور شاہ — چو قرب او طلبی در صفای نیت کوش

بجز ثنای جلالش مساز ورد ضمیر — کہ ہست گوش دلش محرم پیام سروش

رموز مصلحت ملک خسروان دانند

گدای گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

شاہ شجاع برسر اقتدار آیا تو ان ایام میں خواجہ قوام الدین محمد صاحب عیاد اس کا وزیر بنا. حافظ نے اس کی مدح میں ایک قصیدہ کہا ہے جس میں امیر مبارز الدین مظفر کے ہاتھوں ڈھائے گئے مظالم تکفیر و تذویر، ریاکاری و ظاہر پرستی کے دَور دورہ کے ختم ہونے پر اپنی مسرت کا اظہار کیا ہے۔ اس قصیدہ میں رمز و کنایہ میں سب باتیں بڑی خوبی کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ پورے قصیدے کو یہاں نقل کیا جائے۔

قصیدہ در مدح قوام الدین محمد صاحب عیار وزیر شاہ شجاع

زدلبری نتوان لاف زد بآسانی — ہزار نکتہ درین کار ہست تا دانی

بجز شکر دہنی مایہاست خوبی را — بخاتمی نتوان زد دم از سلیمانی

چہ گردہا کہ برانگیختی زہستی من — مباد خستہ سمندت کہ تیز میرانی

بہ ہم نشینی رندان سری فرود آور — کہ گنجہاست درین بی سری و سامانی

اور علمی مباحث میں حُبّ اور بغض سے دُور رہنے کی کتنی ہی سعی کیوں نہ کرے، اس کے باوجود وہ غیر شعوری طور پر کم و کاست حُبّ یا بغض کی طرف مایل ہو ہی جاتا ہے۔ اور بعض اوقات خشک منطق پر اپنے احساسات کو غالب آنے دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم حافظ کے دوستوں اور ممدوحین کی نسبت اپنی ہمدردی کا اظہار کرنے کی طرف راغب ہوں گے، اور جن کو وہ نفرت اور کراہت سے دیکھتے ہیں، ہم بھی ان کے تئیں ایسے ہی احساسات کو اپنے اندر پائیں۔ یعنی چونکہ شاہ شیخ ابو اسحاق کو حافظ نے شفقت اور محبت سے یاد کیا ہے اس لیے ہم بھی اس بادشاہ کی نسبت محبت آمیز احساسات رکھیں۔ حالانکہ ہمیں اس کی کئی بڑی اور ضرر رساں خامیوں کا بخوبی علم ہے۔ اسی طرح ہم امیر مبارز الدین کی نسبت غیر ہمدردانہ رویہ اختیار کریں گے حالانکہ اُس میں چند صلاحیتیں ضرور تھیں۔

ہم بتا چکے ہیں کہ امیر مبارز الدین نے اپنے اغراض کو پورا کرنے کے لیے ظاہر پرستی اور دینداری کا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ دینی امور میں بڑی دلچسپی دکھاتا رہا۔ عبادت اور اطاعت میں اس قدر غلو سے کام لیتا رہا کہ جمعہ کی نماز کے لیے پیدل مسجد کو جاتا۔ علاوہ اُس نے خلیفہ عباس کے ہاتھوں بیعت کی، اور خود کو نائب خلیفہ کہلوایا۔ سکّہ اور خطبہ میں بھی خلیفہ کا نام لایا۔ اس سیاست کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارس میں ریا اور تذویر کا بازار گرم ہوا اور زہد فروشی اور تقویٰ نمائی نے گھر گھر رواج پایا۔ بعض مورخوں نے امیر مبارز الدین کو ایسے القاب سے یاد کیا ہے جو ایران میں عام طور پر علمائے دین کے لیے استعمال ہوا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر قاسم غنی نے "عصر حافظ" میں لکھا ہے کہ:

"شیراز کی فتح کے منصوبہ سے پہلے امیر مبارز الدین بم چلا گیا تاکہ وہاں مرتضیٰ اعظم سید شمس الدین علی کے خاندان میں موجود حضرت رسول اکرمؐ کا موئے مبارک حاصل کرے۔ سید نے دینے سے انکار کیا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد وہ خود اس ڈبیا کو لے کر امیر مبارز الدین کے پاس گیا

مکن کہ می نخوری بر جمال گل یک ماہ — کہ باز ماہ وگر میخوری پشیمانی

بشکرہ تہمت تکفیر کز میان برخاست — بکوش کز گل و مل داد عیش بستانی

جفا نہ شیوہ دین پروری بود حاشا — ہمہ کرامت و لطفست شرع یزدانی

رموز سر انا الحق چہ داند آن غافل — کہ منجذب نشد از جذبہای سبحانی

درون پردہ گل غنچہ بین کہ میسازد — ز بہر دیدہ خصم تو لعل پیکانی

طرب سرای وزیرست ساقیا مگذار — کہ غیر جام می آنجا کند گرانجانی

تو بودی آن دم صبح امید کز سر مہر — بر آمدی و سر آمد شبان ظلمانی

شنیدہ ام کہ ز من یاد میکنی گہ گہ — ولی بمجلس خاص خودم نمی خوانی

طلب نمی کنی از من سخن جفا نیست — وگرنہ با تو چہ بحث است در سخندانی

ز حافظان جہان کس چو بندہ جمع نکرد — لطائف حکمی با کتاب قرآنی

ہزار سال بقا بخشدت مدایح من — چنین نفیس متاعی بچون تو ارزانی

سخن دراز کشیدم ولی امیدم ہست — کہ ذیل عفو بدین ماجرا بپوشانی

ہمیشہ تا بہ بہاران ہوا بصفحہ باغ — ہزار نقش نگارد بخط ریحانی[1]

بباغ ملک ز شاخ امل بعمر دراز
شگفتہ باد گل دولتت بآسانی

ایک محقق اپنی تحقیق کے دوران کتنا ہی غیر جانب دار رہنے کی کوشش کیوں نہ کرے

---

[1] خط ریحانی یا خط ریحان متاخرین میں مروّج اقسام خط میں سے ایک مشہور خط ہے۔ قسمیں یوں ہیں:-

خط نسخ - خط نستعلیق - خط ثلث - خط ریحان - خط محقق - خط رقاع - خط دیوانی -

(کشف الظنون - عنوان رسم الخط)

حافظ نے یہ حال اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ امیر مبارز الدین کو فارس فتح کرنے کے بعد عراق عجم اور تبریز مسخر کرنے کی بڑی خواہش تھی، چنانچہ غزل کے مقطع سے اس بات کا پتہ چلتا ہے:

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گلبیز است — ببانگ چنگ مخور ی کہ محتسب تیز است
صراحی و حریفی گرت بچنگ افتد — بہ عقل نوش کہ ایام فتنہ انگیز است
در آستین مرقع پیالہ پنہاں کن — کہ ہمچو چشم صراحی زمانہ خونریز است
بآب دیدہ بشوئیم خرقہ ہا از می — کہ موسم ورع و روزگار پرہیز است
مجوی عیش خوش از دور باژگون سپہر — کہ صاف این سر خم جملہ دردی آمیز است
سپہر برشدہ پرویزنیست خون افشان — کہ ریزہ اش سر کسری و تاج پرویز است

عراق و فارس گرفتی بہ شعر خوش حافظ
بیا کہ نوبت بغداد و وقت تبریز است

مطلع السعدین میں درج ہے کہ:

"...... امیر مبارز الدین محمدؒ در مملکت فارس رایت استقلال باوج جلال برافراشت و سادات علماء را معزز و موقر داشت و در امر معروف بہ نہی منکر بنوعی سعی نمود کہ کس مدارا بنود کہ نام ملاہی و مناہی برد مولانا شمس الدین محمد شیرازی در آن زمان میفرماید:" اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گلبیز است"...... الخ و مردم را بعلوم شرعیہ ترغیب می فرمود:

علم دین فقہ است و تفسیر و حدیث — ہر کہ خواند غیر ازین گردد خبیث

محتسب کا لفظ امیر مبارز الدین کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اکثر مؤرخ جو حافظ کے قریب العصر تھے، امیر مبارز الدین کو امر معروف اور نہی منکر میں مبالغہ سے کام

جس میں آثار مقدس رکھا گیا تھا، اور کہا کہ میں نے حضرت رسول اکرمؐ کو خواب میں دیکھا۔ انھوں نے مجھے حکم دیا کہ موی جبہ مولوی محمدؐ بن مظفر دو"۔ اس کے عوض میں مبارزالدین نے اُسے اور اس کی اولاد کو بہت بڑی جاگیر دی۔ (صفحہ ۱۷۳)

فارس پر تسلط جمانے کے بعد امیر مبارزالدین نے زاہدوں، فقیہوں اور شریعت مداروں کا حد سے زیادہ احترام کرنا شروع کیا اور ان کی مجلسوں میں حدیث، تفسیر اور فقہ کی بحثیں سنتا رہتا تھا۔ خُم اور سبو کو توڑنے اور مے خانوں کے دروازوں کو بند کرنے کا حکم صادر کیا۔ امر و نہی میں مبالغہ سے کام لیا اور ریا و زرق کے دروازے کھول دیئے۔ چنانچہ شیراز کے اربابِ ذوق اور اصحاب حال اس کو سلطان محتسب کے لقب سے پکارتے رہے حتیٰ کہ اس کے بیٹے شاہ شجاع نے طنز و تعریض کے طور پر اپنے باپ کے بارے میں کہا:

در مجلس دہر ساز مستی پست است
نہ چنگ بہ قانون و نہ دف بر داست
رندان ہمہ ترک می پرستی کردند
جز محتسب شہر کہ بی می مست است

حافظ اس امیر کی سخت گیری اور اس کے متظاہروں اور ریاکار واعظوں اور زاہدوں کو حد سے زیادہ ڈھیل دینے پر سخت دل تنگ ہوئے، اور اس سے .... سماج میں پیدا شدہ فساد کے خلاف سخت شکایت کرتے رہے۔ ذیل میں ایک غزل درج کی جاتی ہے، جس کے مضامین اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ نے اسے ۷۵۸ھ یا ۷۵۹ھ ہجری میں کہا ہو۔ یہ ابو اسحاق کے فوراً بعد کا زمانہ ہے۔ جب فارس میں گونا گوں تبدیلیاں رونما ہوئیں، جن کے نتیجہ میں بڑی خونریزیاں، فتنہ اور فساد بپا ہوئے۔

اگرچہ حافظ کی کوئی ایسی غزل نہیں جس کو ہم سراپا امیر مبارزالدین کی مدح کہہ سکیں لیکن اُن کے کچھ ہمعصر شعراء نے اس امیر کی مدح میں کچھ قصیدے ضرور کہے ہیں، یا کچھ مدحیہ قطعات اور اشعار باقی چھوڑے ہیں۔ حالانکہ مورخ اس حقیقت سے اتفاق کرتے ہیں کہ وہ بہت ظالم اور سنگدل تھا۔ حافظ ابرو کا کہنا ہے کہ وہ ایسی غلیظ زبان استعمال کرتا تھا کہ شتربان بھی شرماتے۔

مولانا صدرالدین عراقی کا بیٹا مولانا لطف اللہ امیر مبارزالدین کے سفر و حضر میں ہمیشہ ساتھ رہا کرتا تھا، اس کا قول ہے کہ میں نے بارہا دیکھا، امیر مبارزالدین تلاوت قرآن میں مشغول ہے اور اسی اثناء میں کسی مجرم کو اس کے سامنے لایا جاتا ہے ہے۔ وہ تلاوت سے اٹھ کر مجرم کو اپنے ہاتھ سے قتل کرتا ہے، اور پھر تلاوت میں مشغول ہو جاتا ہے۔

روضۃ الصفا کے مؤلف نے شاہ شجاع سے نقل قول کرتے ہوئے لکھا ہے، کہ میں نے اپنے باپ امیر مبارزالدین سے پوچھا کہ کتنے لوگوں کو اپنے ہاتھ سے موت کے گھاٹ اتارا ہے؟۔ کہا میں نے آٹھ سو آدمیوں کے سر قلم کئے ہیں۔

جن شاعروں نے امیر مبارزالدین کی مدح کی ہے، ایک کے سوا باقی سب گمنام ہیں، وہ ایک خواجوی کرمانی ہے، جس کی کلیات میں ایسے مدحیہ اشعار کی خاصی تعداد ہے، جن کو امیر مبارزالدین سے نسبت دی جاتی ہے۔ "صنایع الکمال" میں ایک مدحیہ قصیدہ ہے جس کے یہ دو شعر بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں:

چون پدید آمد ز زیر ہفت چتر مستدیر
طلعت سلطان زرین تاج زنگاری سریر

از فراز سبز تنگ چرخ بر خاک اوفتاد
در تواضع بوسہ زد بر نعل یکران امیر

خنگ

لینے کی بنا پر محتسب کے عنوان سے یاد کرتے تھے۔ صاحب روضۃ الصفا نے صراحت سے یہ بات کہی ہے۔ شاہ شجاع کی کہی گئی دوبیتی اوپر درج ہوچکی ہے۔ لیکن حافظ نے ایک اور غزل میں "محتسب" کا لفظ لاکر لطیف پیرایہ میں امیر مبارزالدین کے خلاف اپنی بدگمانی کا اظہار کیا ہے۔ اس غزل کے مقطع میں شاہی کا لفظ لایا گیا ہے، اور اس سے شاہ شجاع مراد ہے۔ لیکن ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ یہ غزل کس وقت، اور کس بادشاہ کے دورِ حکومت میں کہی گئی تھی۔ مطلع یہ ہے:

جان بی جمال جانان میل جہان ندارد
هرکس که این ندارد حقّا که آن ندارد

اور شعر زیر نظر یہ ہے:-

ای دل طریق رندی از محتسب بیاموز
مست است و در حق او کس این گمان ندارد

ایسے ہی مضمون اور لب ولہجہ کی کچھ اور غزلیں دیوان حافظ میں ملتی ہیں۔ مثلاً:-

(۱) دانی که چنگ وعود چه تقریر میکنند   پنهان خورید باده که تعزیر میکنند

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ درج ذیل تین غزلیں بھی واضح طور پر امیر مبارزالدین ہی... کے دورِ حکومت میں کہی گئی ہیں:-

(۱) بود آیا که در می کده ها بگشایند
گره از کار فرو بستهٔ ما بگشایند

(۲) مرا مهر سیه چشمان ز سر بیرون نخواهد شد
قضای آسمانست این و دیگر گون نخواهد شد

(۳) وقت را غنیمت دان هر آنقدر که بتوانی
حاصل از حیات ای جان این دم است گر دانی

عیار کو اس کی سرکوبی کے لیے مامور کیا۔ وزیر نے شاہ یحییٰ پر قافیہ تنگ کیا اور آخر کار شاہ شجاع نے دونوں بار اپنے بھتیجے کو معاف کیا۔

بچپن میں شاہ شجاع کی تعلیم و تربیت حاجی قوام الدین صاحب عیار ہی کے سپرد تھی۔ رفتہ رفتہ وہ وزیر اعظم کے عہدہ تک پہنچ گیا اور شاہ کا معتمد خاص بنا۔ وہ کرمان اور یزد کا حاکم بھی رہ چکا تھا۔ آخر کار شاہ شجاع نے اس کے بڑھتے ہوئے اثر رسوخ سے بدظن ہو کر، اور کئی حاسدوں کے اثر میں آ کر اس لائق وزیر اور عقلمند دوست کو قید کروایا۔ اس کی جایداد جو بہت بڑھ چکی تھی ضبط کروائی گئی اور ۷۶۴ھ ہجری میں بڑے عذاب اور شکنجہ میں ڈال کر اس کو مارا گیا۔ اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے اور ملک کے ہر حصے میں ایک ٹکڑا بھیجا گیا۔ وزارت کا عہدہ کمال الدین حسین رشیدی کو دیا گیا۔

حافظ نے اسی قوام الدین محمد صاحب عیار کی مدح میں ایک قصیدہ کہا ہے اور کئی غزلوں میں اس کا نام لیا ہے۔ اس کی رثاء میں ایک قطعہ بھی لکھا ہے، جس سے سال وفات اخذ ہوتا ہے۔ ان اشعار کے مضمون سے واضح ہوتا ہے کہ حافظ اس وزیر کے دوستوں اور بہی خواہوں کے حلقہ میں شامل تھے۔ صاحب عیار کی مدح میں قصیدے کو ہم گزشتہ اوراق میں نقل کر چکے ہیں۔ ذیل کے مطلع کی غزل میں حافظ نے اپنے مخصوص انداز میں ممدوح کو معشوق کا قایم مقام ٹھہرا کر اس کی تعریف کی ہے:

سحن و خلق و فا کس بیار ما نرسد

ترا درین سخن انکار کار ما نرسد

درج ذیل غزل کے بارے میں بھی گمان ہے کہ شاعر کا روئے سخن اسی صاحب عیار کی طرف ہے۔ بقول غنی یہ غزل لطافت زبان اور طرز ادا کے لحاظ سے حافظ کی بہترین غزلوں میں شامل ہے:

آنکہ رخسار ترا رنگ گل و نسرین داد   صبر و آرام تواند بہ من مسکین داد

خواجو کے ایک اور پُر زور قصیدہ کا مطلع اور دو شعر یوں ہیں :۔

چو عنقای خورشید پر پر بلرزد ۔۔۔ سر زال زر بر افسر بلرزد

چرا این دلِ خستہ ہر دم ز جورت ۔۔۔ در ایام شاہ مظفر بلرزد

محمد جہانگیر محمود رتبت ۔۔۔ کہ از ہیبتش ملک سنجر بلرزد

.... الخ

۴۔ شاہ شجاع

جلال الدین ابو الفوارس شاہ شجاع کی ماں خان قتلغ مخدوم شاہ کرمان کے قراختائی سلسلہ کے حکمران قطب الدین شاہ جہان کی بیٹی تھی۔ اس لحاظ سے وہ ترک زادہ کہلاتا تھا اور ابو الفوارس کا لقب تھا جو دراصل اس کے ممدوحین کا تراشا ہوا تھا جن میں حافظ بھی شامل تھے۔ آغاز جوانی میں اس شہزادے کی تربیت امیر مبارز الدین نے قوام الدین محمد بن علی صاحب عیار کو سونپ دی تھی، جو بعد میں اس کا وزیر بنا۔

شاہ شجاع کا دور حکومت ۷۵۹ ہجری سے شروع ہوا۔ اس نے عراق عجم، کرمان اور فارس کو اپنے بھائیوں میں تقسیم کیا۔ ابتدا میں اُسے اوغانی اور جرمانی قبائل کی سرکوبی کرنا پڑی۔ یہ تاتاریوں کے دو قبیلے تھے جو منگول دور میں کرمان کی حفاظت کے لیے وہاں رکھے گئے تھے۔ چونکہ انھیں مالیات کی ادائیگی سے معاف کیا گیا تھا اس لیے تھوڑے ہی عرصہ میں بہت قوی ہو گئے اور برسر اقتدار حکمرانوں کے لیے زحمت کا باعث بنتے رہے۔ پہلے ایک بار کہا گیا ہے کہ خونی رشتہ کے باوجود اوغانی اور جرمائی قبایل جب بھی موقع پاتے شاہ شجاع کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے۔ شاہ شجاع کے بھتیجے شاہ یحیٰی نے بھی دو بار سرکشی کی اور شاہ شجاع نے اپنے وزیر حاجی قوام الدین صاحب

ہیں کامیاب بھی ہوا۔ شاہ سلطان اس جنگ میں قیدی بنا اور شاہ محمود کے حکم سے اس کی آنکھیں نکلوائی گئیں۔ پانچ سال قبل اسی شاہ سلطان نے شاہ محمود کے باپ امیر مبارز الدین کی آنکھیں نکلوائی تھیں، اور اس واقعہ پر مولانا صدر الدین عراقی نے کہا تھا:-

گر دست فلک چشم ترا میل کشید
در ذات شریف جہان نقص ندید
آنکس کہ بجہان چشم تو آسیب رساند
او نیز بعینہٖ مکافاتش دید

شاہ محمود کی طاقت بڑھ گئی اور اب اُس نے فارس کی تسخیر کا عزم کیا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اُس نے سلطان اویس ایلکان رتبریز اور بغداد کا حکمران، امیر غیاث الدین منصور اینجو اور شاہ نصرت الدین یحییٰ کے علاوہ اور بھی کئی سرداروں کو اپنے ساتھ ملایا۔ ۷۶۵ھ میں وہ اصفہان سے فارس کی طرف چل پڑا۔ شاہ شجاع جنگ کے لیے آمادہ نہ تھا، اس لیے تذکرہ و تنبیہ اور پند و نصایح سے اپنے بھائی کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ دوسروں سے متوصل ہوکر اپنے خاندان کو کمزور نہ کرے۔ حافظ ابرو نے تاریخ جغرافیائی میں اُس منظوم خط کے کچھ اشعار درج کئے ہیں جو شاہ شجاع نے اس موقعہ پر شاہ محمود کو بھیجا تھا۔ لیکن شاہ محمود نے صلح اور تفہیم کے راستے بند کر دیے۔ ناچار شاہ شجاع کو اپنے لشکر کے علاوہ فارس اور لار کے قبایل کو اکٹھا کرنا پڑا تاکہ حملہ آور کا مقابلہ کر سکے۔ اس موقعہ پر اُس نے ایک منظومہ کہا تھا جس کے چند شعر یوں ہیں:

ابو الفوارس دوران منم شاہ جہان
کہ نعل مرکب من تاج قیصر است و قباد
منم کہ نوبت آوازہ صلابت من
چو صیت ہمت من در بسیط خاک افتاد

. . . .

از فراق رخت اے خواجہ قوام الدین داد	در کف غصۂ دوراں دل حافظ خوں شد

یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ اس غزل کے مقطع میں لائے گئے نام کے بارے میں وثوق سے کہا نہیں جاسکتا کہ آیا یہ محمد صاحب عیار ہے یا حاجی قوام قوام الدین حسن یا کوئی تیسرا شخص۔ البتہ ایک دلیل ہمارے اس ظن کی تائید کرتی ہے کہ محمد صاحب عیار کی طرف ہی روئے سخن ہونا چاہیئے۔ غزل کا پانچواں شعر اس دردناک اور فجیع حادثہ کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے جس کے نتیجہ میں قوام الدین صاحب عیار کو ہلاک کر دیا گیا۔ اس کے برعکس حاجی قوام الدین حسن قدرتی موت مرا تھا۔ غزل کا دوسرا شعر بھی نہایت لطیف اور غیر محسوس طریقہ سے صاحب عیار پر شاہ شجاع کے ستم کی طرف اشارہ ہے۔ درج ذیل قطعہ، حافظ نے صاحب عیار کی تاریخ وفات میں کہا ہے، جس سے ۷۶۴ھ حاصل ہوتا ہے:

از بہر خاک بوس نمودی فلک سجود	اعظم قوام دولت و دیں آنکہ بر درش
در نصف ماہ ذی قعدہ از عرصۂ وجود	با آں وجود آں عظمت زیر خاک رفت
آمد حروف سال وفاتش امید جود	تا کس امید جود ندارد دگر ز کس

ذیل میں درج قطعہ کو محمد صاحب عیار کی قتل کے بعد کہا گیا تھا:

بر آب نقطہ شر مش مدار بایستی	گدا اگر گہر پاک داشتی در اصل
چراغی زمیِ خوشگوار بایستی	در آفتاب نکردی فسوس جام زرش
بدست آصف صاحب عیار بایستی	زمانہ گر نہ زر قلب داشتی کارش

شاہ شجاع کا چھوٹا بھائی شاہ محمود بڑا جاہ طلب تھا اور اپنے باپ سے ورثہ میں ملے ہوئے حصہ پر قانع نہ تھا۔ چنانچہ شاہ شجاع کے ساتھ برملا مخاصمانہ اور جنگجویانہ رویہ اختیار کرنے لگا۔ بلکہ ایک بار اصفہان میں شاہ شجاع اور شاہ سلطان کو شکست دینے

کرتا رہا۔ اُدھر شاہ محمود اور شاہ یحییٰ کے درمیان بدگمانیاں بڑھنے لگیں۔ آخر کار شاہ یحییٰ نے اپنے کیے کی معافی مانگی۔ اسی اثنا میں شاہ یحییٰ کا چھوٹا بھائی شاہ منصور اپنے چچا یعنی شاہ شجاع کی خدمت میں داخل ہوا۔ دیوان حافظ میں ایک غزل ملتی ہے، جو غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ شاہ منصور کے شاہ شجاع سے ملحق ہونے کے واقعہ سے متعلق ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت ساری غزلیں ہیں جو شاہ شجاع کے ابرقو اور یزد کے نواحی میں گوشہ گیری کے ایام میں لکھی گئی ہیں۔ قرائن سے اس واقعہ کا اشارہ ایسی غزلوں میں مل ہی جاتا ہے۔ بہر صورت جس خاص غزل کو ہم اس ضمن میں زیر نظر لائے ہیں، وہ یہ ہے:

نسیم باد شمال از دمِ آگہی آورد
که روز محنت و غم رو بکوہی آورد

بمطربان صبوحی دہیم جامہ چاک
بدین نوید کہ باد سحرگہی آورد

بیا بیا کہ تو حور بہشت را رضوان
درین جہان ز برای دل رہی آورد

ہمی رویم بشیراز با عنایت بخت
زہی رفیق کہ بختم بہ ہمرہی آورد

بجبر خاطر ما کوش کہ این کلاہ نمد
بسا شکست کہ با افسر شہی آورد

چہ نالہا کہ رسید از دلم بخرمن ماہ
چو یاد عارض آن ماہ خرگہی آورد

رساند رایت منصور بر فلک حافظ
کہ التجا بہ جناب شہنشہی آورد

شیراز کے لوگ شاہ محمود کے ظلم سے تنگ آچکے تھے۔ شاہ شجاع ایک سال سے وہاں نہ تھا۔ شاہ محمود میں اپنے باپ امیر مبارز الدین کی ساری بُری خصلتیں موجود تھیں۔ وہ سفاک بدکار اور کینہ پرور تھا۔ نہ حسن تدبیر کے زیور سے آراستہ تھا اور نہ ہی قوت عزم سے۔ از بس حریص تھا۔ اور شیراز میں آخر جلایری سرداروں کے ہاتھ کٹھ پتلی بن کر رہ گیا۔ ان سرداروں اور اُن کے لشکریوں کی غرض لوٹ کھسوٹ کے علاوہ

چو مہر تیغ گزار و چو صبح عالم گیر
چو عقل راہ نماو چو شرع نیک نہاد
. . . . الخ

شاہ محمود کی متحدہ فوجوں کا پلّہ بھاری رہا۔ اُس کے کہنے پر شاہ شجاع شیراز سے ابرقو چلا گیا اور شہر کے دروازے مخالف فوجوں کے لیے کھول دیئے گئے۔ ابرقو میں خواجہ جلال الدین تورانشاہ نے شاہ شجاع کی نسبت اپنی صداقت اور خدمت کا اظہار کیا اور حق نمک ادا کیا۔ اُس نے اپنے تدبّر اور حزم و احتیاط سے شاہ شجاع کی رہنمائی کی۔ اس وقت خرم نام کا ایک بہادر پہلوان شاہ شجاع کی خدمت میں داخل ہوا۔ ابرقو سے شاہ شجاع نے کرمان کا عزم کیا، جہاں گرد و نواح کے کچھ قبایل اور کرمان کے سرغنہ کچھ خوف اور کچھ خلوص نیت سے شاہ شجاع سے جا ملے اور اس کے ہاتھ مضبوط ہوئے۔ شبانکارہ کے حاکم اور جزیرۂ ہرمز کا ملک تورانشاہ[۱] بھی اس کے ساتھ ملحق ہوئے اور اس کی اطاعت . . . . قبول کی۔ ادھر شاہ شجاع اپنے ہاتھ مضبوط

---

[۱] اس تورانشاہ کا سلسلۂ نسب ملوک سبا تک پہنچایا جاتا ہے۔ وہ ۷۴۷ھ ہجری میں جزیرہ ہرمز کا حاکم بنا اور تیس برس تک حکمرانی کرتا رہا۔ وہ بڑا علم دوست آدمی تھا۔ اور شاہنامہ کے نام سے اپنے خاندان کی تاریخ میں ایک منظومہ لکھا جس کو اس وقت کے ایک پرتگالی ملاح بنام تشیرا (TEXEIRA) نے دیکھا تھا۔

دیوان حافظ میں دو غزلیں ایسی ہیں جن کے بارے میں خیال ہے کہ انکا روی سخن بھی اسی تورانشاہ کی طرف ہے:

(۱) آنکہ پامال جفا کرد چو خاک راہم — خاک می بوسم و عذر قدمش می خواہم
(۲) من کہ باشم کہ بر آن خاطر عاطر گذرم — لطفہا می کنی ای خاک درت تاج سرم

"زاغ و زغن" کا "عنقا" سے مقابلہ کرنے کے مصداق بتایا۔ جنھوں نے دیوان حافظ کا عمیق مطالعہ کیا ہو، وہ ان کے طرزِ سخن اور روشِ غزل سرائی کو جانتے ہوئے سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کس طرح مختلف معانی و نتائج، مقارن، اور مقتضیات کو نہایت سنجیدگی اور احتیاط سے منتخب کرکے الفاظ و تعبیرات کے ذریعہ باہم پیوست کرتے ہیں۔ مثلاً ممدوح کی جگہ معشوق لاکر ممدوح کی تعریف میں عاشقانہ مضامین لاتے ہیں، وہ اپنی کراہت کو رقیب۔ مدعی یا محتسب وغیرہ جیسے الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ وہ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ ان بلند مضامین اور معانی کا بیان کرنے والا اور لطایف حکمی کو نکات قرآنی کے ساتھ جمع کرنے والا اپنے دور کے سیاسی اور سماجی حادثوں سے غافل نہیں رہ سکتا تھا۔ جب اوضاع آشفتہ ہو جاتے ہیں، تو وہ بھی آشفتہ ہو جاتے ہیں اور سکون اور آرامش میں وہ بھی خوشی اور شادمانی کا اظہار کرتے ہیں بدیہی ہے کہ جب ہم حافظ کے زمانے کے آس پاس کی تاریخ کا مطالعہ کریں۔۔ تو ہمارے سامنے کئی ایسی غزلیں پردہ ذہن پر جلوہ گر ہو جاتی ہیں، جن میں وقت کے کئی حادثوں یا واقعات کی طرف بلیغ اشارات ملتے ہیں۔ شیراز کے ساتھ اتنی دل بستگی رکھنے والا ہرگز اپنے احساسات اور عواطف کو زیرِ پردہ رکھ نہیں سکتا تھا اور وہ اگر اپنی زبان سے نہیں تو نوک قلم سے ضرور اپنے دل کی باتیں کہہ ڈالتے ہیں۔

البتہ یہ درست ہے کہ ہم پورے وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ فلاں غزل فلاں تاریخی واقعہ سے وابستہ ہے، یا فلاں شعر کا فلاں شخص کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ مستند اور معتبر شواہد کی غیر حاضری میں اس طرح کا بیان خطرات سے خالی نہ ہوگا۔ لہٰذا اس ضمن میں ہم جو کچھ کہہ سکتے ہیں وہ صرف قیاس اور قرینہ پر ہی مبنی ہو سکتا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ ہم افراط اور تفریط سے حتی الامکان اپنے آپ کو دور رکھنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ بسا اوقات حدس اور قیاس صحیح ہو سکتے ہیں۔ دہر میں ہم کچھ ایسی

اور کچھ نہ تھی۔ ایسے حالات میں شیرازیوں نے شاہ شجاع کو لازمی طور پر ترجیح دی اور اس بنا پر انھوں نے کلو حسن کی قیادت میں ایک وفد کرمان میں شاہ شجاع کے پاس بھیجا کہ وہ دوبارہ شیراز پر قابض ہو جائے، اور انھیں خونخوار منگولوں اور تاتاریوں کے ظلم و جفا سے آزاد کرے۔

شاہ شجاع میں کئی خوبیاں تھیں، صاحبِ ذوق اور سخن سنج تھا۔ اس کی طبیعت میں ایک طرح کی لطافت تھی، اور سیرت میں خوش پسندی تھی۔ نہ تو سخت گیر تھا اور نہ خشک مغز۔ اس کی بلند ہمتی کا پتہ اس کے بعض اشعار سے چلتا ہے۔ بطور مثال یہ چار شعر ملاحظہ ہوں :۔

فراز قاف قناعت نگنجد ام پر | کہ جز نشیمن سیمرغ نیستم درخور
همای همت خود را ز بهر مرداری | بکرگسان زمانہ چرا کنم همسر
درون کشور عزلت چو تختگاه منست | کلاه عزت باقی مرا بود افسر

بلاد مشرق و مغرب بدست آمد گیر
همان برم ز دنیا که برد اسکندر

(جنگ تاج الدین احمد وزیر کتابخانہ شہرداری۔ اصفہان)

اس پُر آشوب دور میں شیراز کے لوگوں اور وہاں کا حال حافظ نے اشعار کی زبان میں نہایت فصیح اور موزوں انداز میں بیان کیا ہے۔ حافظ نے نہ صرف شاہ محمود کی ستایش ہی نہیں کی، بلکہ ایک بھی شعر ایسا نہیں کہا جس میں غلو اور تظاہر کا شائبہ تک ہو۔ بلکہ اپنی پوری سلامت نفس اور ادبی دیانت کا ثبوت دیتے ہوئے جہاں بھی موقع ملا، اشارہ اور کنایہ میں شاہ محمود کی بُرائی کی ہے اور اس کو "اهرمن" یا "دیو سیرت" جیسی قبیح اصطلاحوں سے یاد کیا ہے۔ شاہ شجاع کے مقابلہ میں اس کی حکومت کو "باز" کی "مرغان قاف" کے سامنے لاف زنی کے برابر کہا اور

کی مدد دینے کا وعدہ کیا۔ شاہ محمود کے معتبر امراکبھی شاہ شجاع سے مل گئے۔ غالباً مندرجہ ذیل مطلع کی غزلیں حافظ نے ان دنوں میں کہی ہیں، جب شاہ شجاع شیراز کے باہر میدان سعادت میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھا:

۱۔ بملازمان سلطان کہ رساند این دعا را　　کہ بشکر پادشاہی ز نظر مران گدا را

۲۔ ساقیا آمدن عید مبارک بادت　　وآن مواعید کہ کردی نرود از یادت

۳۔ سحرم دولت بیدار ببالین آمد　　گفت برخیز کہ آن خسرو شیرین آمد

۴۔ ای در رخ تو پیدا انوار پادشاہی　　در فکرتِ تو پنہان صد حکمت الٰہی

دو سال کے وقفہ کے بعد شاہ شجاع پھر شیراز میں فاتحانہ انداز میں داخل ہوا۔ شیراز سے طویل مدت تک دور رہنے اور مصایب کے ٹوٹنے اور صحت کی نادرستی کی وجوہات سے بہت آزردہ دل ہوا تھا۔ ان ہی دنوں کچھ ظاہر پرست زاہدوں اور صوفیوں نے جن کی اس دور میں تعداد کم نہ تھی، اُس کی آشفتگی اور پریشانی سے ناجائز فائدہ اُٹھانا چاہا۔ وہ اس کی ملامت کرنے لگے کہ اُس نے شرعی احکام اور وظایف کی عدولی کی ہے، اور اپنے باپ کے بتائے ہوئے راستے سے انحراف کیا ہے، جس کے نتیجہ میں وہ مصیبتوں اور تکلیفوں سے دو چار ہوا ہے۔ جب دوسری بار شیراز پر قابض ہوا تو ان لوگوں نے ڈرا دھمکا کر اسے مجبور کیا کہ وہ زاہدوں۔ واعظوں اور شریعت کے پابند لوگوں کی تعظیم و تکریم کرے اور امر و نہی میں سستی نہ کرے۔ اس مکر کا شاہ شجاع پر بڑا اثر ہوا، اور وہ اِن ظاہر پرست ... دینداروں اور زاہدوں کے نزدیک آتا گیا۔

غزلیں درج کریں گے، جو غالباً شاہ شجاع کی شیراز سے ہجرت اور شاہ محمود کے تسلط کے دوران کہی گئی ہوں۔ گویا یہ ۷۶۵ سے لیکر ۷۶۷ھ تک کے زمانے کی ہو سکتی ہیں:

۱۔ دیریست که دلدار پیامی نفرستاد — ننوشت سلامی و کلامی نفرستاد

۲۔ دیدم بخواب دوش که ماهی برآمدی — کز عکس روی او شب هجران بر آمدی

۳۔ زهی خجسته زمانی که یار باز آید — بکام غمزدگان غمگسار باز آید

۴۔ اگر آن طائر قدسی ز درم باز آید — عمر بگذشته به پیرانه سرم باز آید

۵۔ خوش خبر باشی ای نسیم شمال — که بما میرسد زمان وصال

۶۔ یارب آن آهوی مشکین بختن باز رسان — وآن سهی سرو خرامان بچمن باز رسان

۷۔ نه هر که چهره برافروخت دلبری داند — نه هر که آئینه سازد سکندری داند

کلو حسن جس کو شیرازیوں نے اپنی طرف سے شاہ شجاع کے پاس بھیجا تھا، اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوا، اور ۷۶۷ ہجری میں شاہ شجاع نے ایک لشکر جرّار لے کر شیراز پر چڑھائی کی۔ شاہ محمود نے پُل فسا اور پھر شہر کے باہر مقاومت کی۔ پہلوان خرّم اور خود شاہ شجاع نے اس کی فوج کو شکست دی۔ شیراز کے لوگوں نے اور خاص کر محلہ کلویان کے باشندوں نے شاہ شجاع کی فتح پر خوشی کا اظہار کیا، اور اُسے ہر طرح

صاحب ذوق کو چاہئے کہ اس کے مطالعہ میں بڑے غور و خوض سے کام لے۔

قصیدے کا مطلع یہ ہے:۔

شد عرصۂ زمین چو بساطِ ارم جوان
از پرتو سعادت شاہ جہان ستان [۱]

ذیل میں دی گئی غزل کے بارے میں قرائن اور حیث مضمون کی بنا پر کافی اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اس وقت لکھی گئی ہوگی جب فتح نامۂ اصفہان پر دستخط ہو چکے ہونگے اور شاہ شجاع شیراز کو لوٹ آیا۔ گویا یہ غزل ۷۶۹ ہجری میں نظم ہوئی ہوگی۔

ببین هلال ماه و بخواه ساغر راح	که ماه امن و امان است و سال صلح و صلاح
عزیز دار زمان وصال را کاندم	مقابل شب قدرست و روز استفتاح
نزاع بر سر دنیای دون کسی نکند	بآشتی بسر ای نور دیده گوی فلاح
دلا توفارغی از کار خویش می ترسم	که کس درت نگشاید چو گم کنی مفتاح
بیار باده که روزش بخیر خواهد بود	هر آنکه جام صبوحش نهد چراغ صباح
کدام طاعت شایسته آید از من مست	که بانگ صبح ندانم زخالق الصباح
بیوی وصل چو حافظ شبی بروز آور	که بشگفد گل بختت زجانب فتاح

۱؎ حافظ نے قصیدوں میں ظہیر فاریابی کی روش اختیار کی ہے۔ مندرجہ بالا قصیدہ بھی ظہیر کے اس قصیدہ کی تقلید میں ہے:۔

گیتی ز فر دولت فرماندۂ جہان — ماند بہ عرصۂ ارم و روضۂ جنان

اس کے علاوہ ملاحظہ ہو:۔

حافظ	ز دلبری نتوان لاف زد بآسانی	ظہیر	درین ہوس کہ من افتادہ ام نہ بادانی
	سپیدہ دم کہ صبا بوی لطف جان گیر	"	سپیدہ دم کہ ہوا مژدۂ بہار دہد

کبھی کبھار اس وقت کے ایک مشہور فقیہہ مولانا قوام الدین عبداللہ کے حلقۂ درس میں شامل ہوتا اور ابن حاجب کی "اصول" پر خواجہ عضدالدین ایجی کی شرح پڑھتا۔ مسند قضا کرتا بہاءالدین عثمانی کوہ گیلوئی کے سپرد کر دی۔ وہ شافعی عالم تھے۔ انھی ایام میں شاہ شجاع نے مولانا غیاث الدین گیتی کو دو لاکھ دینار دے کر مکۂ مکرمہ بھیجا تاکہ وہاں مجاوروں کے لیے خانقاہ بنوائے اور اس کے مرقد کے لیے زمین کا ایک ٹکڑا خرید ے جامع النور میں ذکر ہوا ہے کہ جب یہ خانقاہ خانۂ کعبہ کے پہلو میں بنی تو شاہ شجاع نے اس کے لیے دو عربی کے شعر کہے۔ اس نے خلیفہ المتوکل کے ہاتھ پر بیعت کی اور علمائے دین سے کہا کہ اس سلسلہ میں رسایل لکھیں۔

شیراز میں متمکن ہونے کے بعد ۷۶۸ ہجری میں شاہ شجاع نے اصفہان کا عزم کیا قصر زرد کے قریب مختصر سی لڑائی کے بعد شاہ محمود اصفہان لوٹ آیا اور بھائی کے پاس ایک ایلچی کو یہ پیغام دے کر بھیجا کہ میں نے شیراز کسی جنگ و جدل کے بغیر تمھیں دے دیا تھا کیا تمھیں چاہیے ایسی ہی فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے اصفہان مجھے سونپ دو۔ شاہ شجاع نے یہ پیشکش مان لی اور دونوں بھائیوں کے درمیان صلح ہوئی اور ادری کا عہد و پیمان کیا گیا۔ چنانچہ دونوں بھائیوں نے ایک صلح نامہ پر دستخط کیے جو فتح نامہ اصفہان[1] کے نام سے مشہور ہے۔

حافظ نے شاہ شجاع کی مدح میں ایک پر زور قصیدہ کہا ہے جو غالباً انھی ایام یعنی ۷۶۸ ہجری کے ماہ ذی الحجہ کے اواخر یا سال ۷۶۹ھ کے محرم کے آغاز میں کہا گیا تھا۔ چونکہ اس قصیدہ میں کچھ تاریخی واقعات کی طرف بلیغ اشارے ہوئے ہیں اس لیے ہر

---

[1] اس فتح نامہ کی سبک انشاء کو اُس زمانے کی فارسی نثر کا بہترین نمونہ بتاتے ہوئے ملک الشعراء بہار نے اس کے اقتباسات کو "سبک شناسی" میں درج کیا ہے۔

...اس کے بھائی شاہ شجاع سے الگ کرنا چاہتا تھا تاکہ ان

 ...کش بڑھ جائے اور اس کے ہاتھ مضبوط ہو سکیں۔

دوران شاہ کے عہد ... بیوی خان سلطان جو اینجو خاندان کے سلطان امیر غیاث الدین

۷۸۶ ہجری تک۔ ...پنے شوہر کے ارادوں سے باخبر ہوئی۔ اور یہ فطری امر تھا کہ وہ اس

کے منصب پر فائز ...ٹ پیدا کرے۔ اگرچہ مظفریوں نے اس کے باپ کے خاندان کو ختم

سنجیدہ دور سے ... ہم وہ اپنے شوہر کے تئیں وفادار رہی تھی۔ محمود گیتی اپنی تالیف تاریخ

وزیر اتنی طویل ...طراز ہے کہ جس وقت شاہ محمود نے شاہ شجاع کی فوجوں کے ذریعہ شیراز

تعجب کی بات ... سے تنگ آکر فرار کیا۔ اس نے اپنے پیچھے اپنی اسی بیوی یعنی خان سلطان کو

...بخود اتفـ...

وہاں کی حکومت سپرد کردی اور اپنے وزیر تاج الدین کو اس کی معاونت کے لیے مقرر کیا۔
خان سلطان نے بڑی دلیری سے دشمن کا مقابلہ کیا۔ چنانچہ خود گھوڑے پر سوار ہو کر
فوج کی کمان کرتی رہی، بلکہ ایک بار گھوڑے سے گر کر اس کے دو دانت ٹوٹ گئے اور جبڑا
زخمی ہوا لیکن فوراً پٹی کروا کے پھر سوار ہوئی اور مقابلہ کرتی رہی

اب چونکہ اس کا شوہر جلایری خاندان کی ایک شاہزادی بیاہنا چاہتا تھا،
لہٰذا یہ اس سے کب برداشت ہو سکتا تھا۔ خان سلطان نہایت خوبصورت اور
چالاک عورت تھی اس نے شاہ شجاع کو اپنے خاص قاصدوں کے ذریعہ تحفے تحائف
بھیجے اور اپنے شوہر سے جذبہ انتقام کے تحت شاہ شجاع سے عشق و محبت کا اظہار
کرتے ہوئے اسے شاہ محمود کے ارادوں سے باخبر کیا، بلکہ تاکید کی کہ فوراً اصفہان پر
چڑھائی کرے۔ اس نے یہ وعدہ بھی کیا کہ اگر شاہ شجاع نے اصفہان پر چڑھائی
کی تو وہ اس کی مدد کرے گی۔

بہرصورت شاہ شجاع نے اصفہان پر چڑھائی کردی۔ لیکن شاہ محمود نے
عجز و انکسار سے کام لے کر اسے شیراز سے لوٹ جانے پر مجبور کیا۔ اس کے فوراً بعد

زمان شاہ شجاع است و دور حکمت و شرع
براحت ای دل و جان کوش در مساء و صباح

مسلسل جنگ و جدل اور پے در پے نقل و حرکت سے دونوں بھائی مضمحل ہو چکے تھے اور ان کی مالی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ ادھر جلایری ۔۔۔ سلطان اویس ایلکانی تبریز اور بغداد میں اپنی طاقت میں روز افزوں اضافہ کرتا رہا۔ آخر کار دونوں بھائیوں نے اس بڑھتے ہوئے خطرے کو بھانپ کر کوئی ایسی تدبیر سوچنی چاہی کہ یہ سرکش حریف ان کے قابو میں رہے۔ شاہ شجاع نے اس غرض کو حاصل کرنے کے لیے دوسری چال چلی۔ اپنے وزیر امیر مبارز الدین قورچی کو ۷۷۰ ہجری میں ایک پیغام دے کر اویس ایلکانی کے دربار میں بھیجا۔ پیغام میں کہا گیا تھا کہ اول وہ "برادر مشتاق" (یعنی اویس) آذربائیجان میں شاہ شجاع کی فوج کو مستقر ہونے کی اجازت دے تاکہ کسی دشمن کے حملے کا خوف باقی نہ رہے اور اس علاقہ کا تحفظ کیا جائے۔ دوم یہ کہ سلطان اویس اپنی بہن (یا بقول دیگر ان بیٹی) کی شادی شاہ شجاع کے ساتھ کرنے پر رضامند ہو جائے۔

سلطان ایلکانی کو یہ خط پسند نہیں آیا۔ غالباً وجہ یہ تھی کہ شاہ شجاع نے اُسے "برادر مشتاق" اور "آن برادر" کے عنوانوں سے خطاب کیا تھا، جو اُسے بُرا لگے، کیونکہ وہ شاہ شجاع کو اپنے برابر کا رتبہ دینے پر رضامند نہ تھا۔ ادھر شاہ محمود نے بھی اپنے خاص ایلچی اور وزیر خواجہ تاج الدین کو مکمل اختیارات دے کر سلطان اویس ایلکانی کے پاس اس کی لڑکی دوندی کی خواستگاری کے لیے بھیجا۔ خواجہ تاج الدین بڑا چرب زبان آدمی تھا اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ سلطان اویس نے دوندی کو اصفہان میں شاہ محمود کے پاس روانہ کرنا مان لیا۔

کرنے کی ایک سازش کی۔ لیکن جیسے اکثر ہوتا ہے، بجائے اس کے کہ توران شاہ اُس کے کھودے ہوئے کنویں میں گرے، وہ خود اس میں جا گرا۔ چونکہ جلال الدین توران شاہ حافظ کا ممدوح رہا ہے اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ اُس کے خلاف شاہ حسن کی سازش کے واقعہ کو درج کیا جائے تاکہ حافظ کے اُس قصیدہ پر کچھ روشنی پڑے جو اس نے توران شاہ کی مدح میں کہا ہے۔

شاہ حسن نے یہ سازش کی کہ ایک رقعہ جو بظاہر توران شاہ اور اُس کے ایک دوست اور شیراز کے سربرآوردہ شخص خواجہ ہمام الدین محمود کی طرف سے مبینہ طور پر شاہ محمود کو لکھوایا گیا تھا شاہ شجاع کی تحویل میں دلوایا گیا۔ خط میں شاہ محمود کو شیراز پر حملہ کرنے کی ترغیب دی گئی تھی اور اپنی (توران شاہ اور ہمام الدین) کی طرف سے اس کی پوری مدد کا وعدہ کیا گیا تھا۔ شاہ شجاع اس خط کے مضمون کو پڑھ کر غضبناک ہوا اور فوراً توران شاہ اور ہمام الدین کو بلوا کر اُن سے باز پرس کی۔ توران شاہ نے کہا، اگرچہ یہ خط میرے خط سے بہت ملتا جلتا ہے لیکن یہ رقعہ ہرگز میں نے نہیں لکھا ہے۔ اور مجھے اس کے بارے میں کوئی علم نہیں، توران شاہ نے عرض کی کہ اُن دونوں کو قید کیا جائے، کیونکہ انھیں قتل کرنا تو آسان کام ہے، لیکن بادشاہ کو چاہیے کہ اس خیانت کاری کی تحقیق کروائے۔ چنانچہ اِن دونوں ملزموں کو قید میں ڈالا گیا۔ اس کے بعد شاہ شجاع نے اپنے وزیر شاہ حسن سے اس معاملہ کے بارے میں پوچھ تاچھ کی۔ اُس نے کہا کہ میں نے توران شاہ کے دوات دار سے دو ہزار دینار کے عوض رقعہ حاصل کیا۔ چنانچہ شاہ محمود نے اپنے ہاتھ سے اس رقعہ کے پیچھے توران شاہ پر اپنی عنایات اور خوشنودی کا اظہار کیا تھا۔

خواند میر نے "دستور الوزرار" میں اس واقعہ سے متعلق خط کی عبارت اور شاہ محمود کے جواب کو یوں نقل کیا ہے:

شاہ محمود کو جاسوسوں کے ذریعہ معلوم ہوا کہ یہ سب سازش اس کی بیوی خان سلطان کی تھی۔ لہذا بیوی کو گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا۔ سلطان اویس نے اپنی بیٹی دوندی کو ہراول کے ساتھ اصفہان روانہ کیا جہاں وہ شاہ محمود کے نکاح میں آئی۔
سلمان ساؤجی اس دوندی کا مدح گو تھا، چنانچہ اس کی مدح میں سلمان کے ایک قصید کا مطلع یہ ہے:

سایۂ لطف خدا سلطان دوندی آنکہ ہست
آفتاب دین و دولت قہرمان ماؤطین

دوندی اور شاہ محمود کی شادی کے موقعہ پر بھی سلمان ساؤجی نے ایک دلچسپ قصیدہ کہا، جس کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

آسمان ساخت در آفاق یکی سور چہ سور
کہ ازان سور شد اطراف جہاں مسرور
حبذا سور و سروری کہ اگر در نگری
خانۂ زہرہ بود برج ازان حالی سور

لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرا کہ شاہ محمود اپنے کئے پر پچھتانے لگا اور اپنی مرحوم بیوی خان سلطان کی یاد میں آشفتہ حال ہونے لگا۔ دوندی نے یہ جان کر کہ شاہ محمود خان سلطان کی یاد میں بیکل ہے، اس عورت کی نعش کو قبر سے نکلوا کر جلانے کا حکم دیا۔

بہر صورت دونوں فوجوں کا صحرائے چاشت میں آمنا سامنا ہوا۔ شاہ شجاع نے اپنے بھتیجے شاہ منصور کو فوج کے مرکز کی کمان دی۔ شاہ محمود نے شکست کھائی اور اصفہان کی طرف نکل گیا۔ شاہ شجاع نے شیراز کا رخ کیا۔ اس موقعہ پر ایک واقعہ رونما ہوا جس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

شاہ شجاع کے وزیر شاہ حسن نے اپنے رقیب خواجہ جلال الدین توران شاہ کو تباہ

خواجہ حافظ کی زندگی کا بہترین حصہ شاہ شجاع کے لائق وفائق وزیر جلال الدین
توران شاہ کے عہد وزارت کے طویل عرصہ سے مقارن ہے یعنی ۷۶۶ سے لے کر
۷۸۶ ہجری تک، بیس برس کے عرصہ تک جلال الدین ..... توران شاہ وزارت عظمیٰ
کے منصب پر فائز رہا یہی دور حافظ کی زندگی اور شاعری کا پختہ پرکار اور نہایت
سنجیدہ دور ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ ایران کی تاریخ میں بہت کم مثالیں ملتی ہیں کہ کوئی
وزیر اتنی طویل مدت تک اتنے بڑے عہدے پر برقرار رہا ہو۔ اور اس سے بھی زیادہ
تعجب کی بات یہ ہے کہ کم تر وزیر توران شاہ کی طرح طبعی موت مرے ہیں.....
مورخین اتفاق کرتے ہیں کہ جلال الدین توران شاہ نہایت متین۔ عاقل خیر اندیش،
بردبار اور سلجھا ہوا آدمی تھا اور اپنے وقت کے پیرہ دست ادیبوں میں شمار ہوتا تھا۔
چنانچہ شاہ شجاع نے دم نزع اپنے بیٹے اور ولی عہد زین العابدین کو خبردار کہا کہ وہ توران
شاہ کو اس کے جلیل عہدہ سے ہرگز نہ ہٹائے، اور اس کے مشورے کے بغیر کوئی
کام نہ کرے۔

حافظ نے اس عقل مند وزیر سے بڑی محبت اور عقیدت کا اظہار کیا ہے۔
ڈاکٹر قاسم غنی کا قول ہے کہ حافظ کی جن غزلوں میں آصف عہد۔ آصف دوران۔
خواجہ وزیر یا خواجہ جہاں جیسے القاب اور عنوان لائے گئے ہیں، اگر وہ کلاً نہیں، تاہم
بڑی حد تک اسی جلال الدین توران شاہ کی طرف مشار ہیں۔ اس وزیر کی موت پر
حافظ نے ایک قطعہ بھی کہا ہے، جس میں اس کے ممتاز اخلاق، اس کی خیر خواہی،
حق بینی اور حق گوئی کی تعریف کی گئی ہے

قطعہ یہ ہے:-

آصف عہد زمان، جان جہان توران شاہ
کہ درین مزرعہ جز دانہ خیرات نکشت

جز دانۂ خیرات

در مضمون کتابت آنکه ہر گاہ رایات نصرت آیات پادشاہ بنواحی شیراز رسد ما بندگان دروازہ کشادہ ملازمان را بشیراز درمی آوریم و التماس نمودہ بودند کہ جواب رقعہ بر ظہر قلمی شود و شاہ محمود در ظہر نوشتہ بود کہ در فلاں روز موکب همایون کہ بظاہر شیراز خواہد رسید باید کہ ایشان بہ عاطفت ما امیدوار بودہ در تمشیت امری کہ وعدہ کردند اہتمام بتقدیم رسانند ؟

توران شاہ کے دوات دار کو شکنجہ میں ڈالا گیا لیکن اس حقیقتاً اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ دوبارہ تفتیش پر شاہ حسن نے کہا کہ توران شاہ کے خواجہ سراؤں سے پوچھا جائے لیکن شاہ شجاع چونکہ باہوش اور کار آزمودہ آدمی تھا بھانپ گیا کہ دراصل شاہ حسن ہی کی سازش ہے، کیونکہ اس قدر اہم رقعہ خواجہ سراؤں کے ہاتھوں میں دیا نہیں جا سکتا۔ اُسے شکنجہ میں ڈالا گیا اور بڑے عذاب کے بعد اس نے اقرار کیا کہ وہ توران شاہ سے حسد رکھتا ہے، اس لیے محمود حاجی عمر منشی سے جو اپنے زمانے کا مشہور خط ساز اور جعال تھا، خط لکھوا کر شاہ محمود کو بھیجا گیا تھا۔ شاہ حسن کا گلا گھونٹا گیا اور جلال الدین توران شاہ اور ہمام الدین دونوں کو رہا کر دیا گیا۔

جلال الدین توران شاہ کی مدح میں حافظ کے مندرجہ ذیل قصیدہ میں تاریخی لحاظ سے کچھ معلومات کا پتہ چل سکتا ہے۔ اس کے مضامین سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ توران شاہ کی زندان سے رہائی اور دوسری بار وزیر اعظم بننے کے موقعہ پر کہا گیا ہے اگرچہ دیوان حافظ میں اسے غزلیات میں شامل کیا گیا ہے لیکن غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ یہ غزل نہیں بلکہ قصیدہ ہے۔ حافظ نے دراصل کئی بار غزل اور قصیدہ کی روشوں کو باہم پیوست کر دیا ہے اور غزل نما قصیدہ کی ایجاد کی ہے۔ قصیدۂ زیر نظر یہ ہے:-

خیر مقدم مرحبا ای طایر فرخندہ دم   شادمان کردی مرا لازم ترا استر اقدم

توران شاہ میں پائی جاتی تھیں۔ ہم اس طرح کے تمایلات پر اس کتاب کی دوسری جلد میں بحث کریں گے، جو ہم نے حافظ کی شاعری کے لیے مخصوص کی ہے۔ یہاں صرف اتنا کہنا ضروری ہے کہ مندرجہ بالا غزلوں کے علاوہ اور بھی کئی غزلیں ہیں جن میں توران شاہ کا نام نہیں آیا ہے، لیکن آصف۔ وزیر۔ خواجہ وغیرہ جیسے علامتی الفاظ وارد ہوئے ہیں اور ان کے نفس مضمون اور حیثیت معانی کی بنا پر اطمینان سے کہا جا سکتا کہ ایسی غزلوں کا روئے سخن بھی اسی جلال الدین توران شاہ کی طرف ہے۔ یہ غزلیں کس سال اور کن حالات کے پس منظر میں لکھی گئی ہیں یہ کہنا اگر مشکل نہیں تو آسان بھی نہیں اور نہ اشتباہ سے خالی ہے البتہ قیاس کی بنا پر ہم غزلوں کے مضامین سے ہی کچھ معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ ذیل میں ہم ایسی غزلوں میں سے تین چار کو نقل کریں گے جو زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔

۱۔ صوفی از پرتو می راز نہانی دانست — گوہر ہر کس ازین لعل توانی دانست

۲۔ روضۂ خلد برین خلوت درویشان است — مایۂ محتشمی خدمت درویشان است

۳۔ بار آگی ودل تنگ مرا مونس جان باش — وین سوختہ را محرم اسرار نہان باش

۴۔ دردم از یار است و درمان نیز هم — دل فدای او شد و جان نیز هم

۵۔ دوش با من گفت پنہان کاردانی تیز ہوش — وز شما پنہان نشاید کرد سر می فروش

دیوان حافظ میں موجود ایک اور غزل پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں لائے گئے مضامین اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو جلال الدین توران شاہ کو رکن الدین حسن

ناف هفته بد و از ماه صفر کاف و الف

که بگلشن شد و این گلخن پر دود بهشت

آنکه میلش سوی حق بینی و حق گویی بود

سال تاریخ وفاتش طلب میل بهشت

ذیل میں حافظ کی اُن غزلوں کے مطلع درج کیے جاتے ہیں جن میں صریحاً اور بلا شک تردید اسی توران شاہ کا نام لے کر اس کی مدح کی گئی ہے۔

۱- چل سال بیش رفت کہ من لاف میزنم — کز چاکران پیر مغان کمترین منم

۲- گرم از دست برخیزد کہ با دلدار بنشینم — ز جام وصل مینوشم ز باغ عیش گل چینم

۳- ز کوی یار می آید نسیم باد نوروزی — ازین باد ار مدد خواہی چراغ دل برافروزی

۴- بشنو این نکتہ کہ خود را ز غم آزاد کنی — خون خوری گر طلب روزی ننہادہ کنی

۵- تو مگر بر لب آبی بہوس بنشینی — ورنہ ہر فتنہ کہ بینی ہمہ از خود بینی

۶- سحرم ہاتف میخانہ بدولت خواہی — گفت باز آی کہ دیرینہ این درگاہی

ان غزلوں میں معمولاً عارفانہ مضامین پائے جاتے ہیں۔ مجموعی حیثیت سے ان غزلوں پر غور کرنے سے ہماری اس رائے کی تائید ہوتی ہے کہ حافظ کا روئے سخن اسی وزیر کی طرف ہے کیونکہ ادب نوازی اور خوش ذوقی کا تقاضا تھا کہ حافظ اپنے ممدوح توران شاہ کے تمایلات کی رعایت کرتا بالخصوص جب کہ شاعر خود اُن بلند قدروں اور حسن اخلاق کا علمبردار تھا جو جلال الدین

بروازخانۂ گردون بدر نان مطلب — کاین سیہ کاسہ در آخر بکشد مہمان را

ہر کرا خوابگہ آخر مشتی خاک است — گو چہ حاجت کہ بافلاک کشی ایوان را

ماہ کنعانی من مسند مصر آنِ تو شد — وقت آنست کہ بدرود کنی زندان را

حافظا می خور و رندی کن و خوش باش ولی

دام تزویر مکن چون دگران قرآن را

۷۷۶ھ میں دو اہم واقعات یکے بعد دیگرے رونما ہوئے، یعنی شاہ شجاع کے دو بڑے حریف جلایری سلطان اویس ایلکانی اور شاہ شجاع کا بھائی سلطان محمود دونوں فوت ہوئے۔ سلطان اویس اور اس کے خاندان یعنی جلایریوں کا سب سے بڑا مدح گو شاعر سلمان ساوجی تھا۔ اس شہزادے کی موت پر اس نے ایک پُر سوز مرثیہ کہا ہے جس کا مطلع یہ ہے:

ای فلک آہستہ رو کاری نہ آسان کردہ ای — ملک ایران را بہ مرگ شاہ ویران کردہ ای

حافظ نے بھی اسی سلطان کا نام ایک غزل میں لیا ہے جس کا مطلع یہ ہے:

خوش آمد گل وزان خوشتر نباشد — کہ در دستت بجز ساغر نباشد

اپنے بھائی شاہ محمود کی مکرر جسارتوں کے باوجود شاہ شجاع بڑی فراخ دلی کا ثبوت دیتا رہا اور اس کی باغیانہ حرکات کو نظرانداز کرتا رہا اور جب بھائی کی موت کی خبر اسے ملی تو پورا سوگ منایا اور سعدی کے یہ اشعار گنگناتا رہا۔

بسیار سالہا بہ سر خاک ما رود — کین آب چشمہ آید و باد صبا رود

این پنج روز مہلت ایام آدمی — بر خاک دیگران بہ تکبر چرا رود ... الخ

اس سانحہ سے متعلق شاہ شجاع نے ایک رباعی بھی کہی تھی، یعنی

محمود برادرم شہ شیر کمین

می کرد خصومت از پی تاج و نگین

یزدی کی طرف سے دشمنانہ سازش کے نتیجہ میں پیش آیا۔ حافظ نے رکن الدین کے دام تزویر بچھانے کی طرف رمز و کنایہ میں اشارہ کیا ہے اور جلال الدین توران شاہ کی قید سے رہائی پہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے رونق بہار اور تجدید جوانی وغیرہ علامتوں اور عارفانہ تجاہل سے کام لیا ہے۔ اس غزل میں موضوع مخصوص کو نظر میں رکھنے کے علاوہ بڑے تنوع اور پختہ تجربوں کا بھی اظہار کیا گیا ہے۔ حافظ کی غزلوں میں کسی دوسرے وزیر کے لیے قید و بند اور پھر رہائی جیسے مضمون کو نہیں لایا گیا اور نہ ہی کوئی دوسرا وزیر ایسا گزرا جو اس کے دورِ زندگانی میں قید ہو کر آزاد ہوا ہو۔ لہذا اغلب ہے کہ غزل کا روئے سخن بھی واقعہ متذکرہ کے پس منظر میں جلال الدین توران شاہ ہی کی طرف ہو:

رونق عہد شباب است دگر بستان را	می رسد مژدۂ گل، بلبل خوش الحان را
ای صبا گر بجوانان چمن باز رسی	خدمت ما برسان سرو و گل و ریحان را
گر چنین جلوہ کند مغبچۂ بادہ فروش	خاکروب درِ میخانہ کنم مژگان را
ای کہ بر ماہ کشی از عنبر سارا چوگان	مضطرب حال مگردان من بی سرو سامان را
ترسم این قوم کہ بر درد کشان می خندند	در سر کار خرابات کنند ایمان را
یار مردان خدا باش کہ در کشتی نوح	ہست خاکی کہ بآبی نخرد طوفان را [۱]

---

(۱) اس شعر کی وضاحت کرتے ہوئے استاد سعید نفیسی کہتے ہیں "مردان خدا باش و چون مردان خدا متواضع و خاکسار ہستند، در کشتی نوح خاکی ہست یعنی ہمان مقدار خاکی کہ از زمین برداشتہ اند کہ بہ ہمہ حقارت و فروتنی کہ دارد توفان را بآبی نمی خرند یعنی آبرو وی برای طوفان قایل نیست و بہ توفان اہمیت نمی دہند و درین صورت مردان خدا ہر چہ حقیر باشند مانند آن مقدار خاکی ہستند کہ باکی از طوفان ندارند۔

(در مکتب استاد۔ از برنامہ ہای رادیو ایران صفحہ ۸۳)

۷۶۸ھ ہجری میں سلطان اویس ایلکانی کے دوسرے بیٹے سلطان احمد نے اپنے بھائی سلطان جلال الدین حسن کے خلاف بغاوت کی اور اپنے خویشاوندوں اور خاندان کے بہت سے افراد کا خون بہانے کے بعد آذربائیجان پر قابض ہوا۔ لازمی تھا کہ ان حالات میں شاہ شجاع اس کی سرکوبی کرتا۔ اور آخر کار دونوں فوجوں کے درمیان خوفناک جنگ ہوئی۔ سلطان احمد نے شکست کھائی اور پسپا ہو کر اس نے بغداد کی راہ لی اور تبریز شاہ شجاع کے کمانڈروں کی تحویل میں آگیا۔ سلطان احمد نے صلح و آشتی کی درخواست کی جو شاہ شجاع نے قبول کی اور وعدہ کیا کہ بنفس نفیس سلطانیہ جا کر اس قضیہ کو سلجھا دے گا۔

سلطان احمد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سخت بے رحم اور خونی تھا۔ بھائیوں اور اپنے خاندان کے افراد کے علاوہ اس نے کئی اور لوگوں کو جو اس کی غرض و غایت کی راہ میں رکاوٹ بنے تھے، کالعدم کر دیا۔ اس کے باوجود وہ مملکت داری کے حسن انتظام اور ذوق شعر کی صلاحیت سے عاری نہ تھا۔ چنانچہ خود بھی بعض اوقات اکا دکا شعر موزون کرتا تھا۔ حافظ نے اس سلطان کی مدح میں دو غزلیں لکھی ہیں۔ ایک میں صریحاً اس کا نام لیا ہے اور دوسری میں قرائن سے پتہ چلتا ہے اس کا اشارہ بھی اسی سلطان احمد کی طرف ہے۔ پہلی غزل کا مطلع یہ ہے:-

احمد اللہ علی معدلۃ السلطان　　　احمد شیخ اویس حسن ایلکانی

اور دوسری غزل یہ ہے:

کلک مشکین تو روزی کہ زما یاد کند　　　ببرد اجر دو صد بندہ کہ آزاد کند

قاصد حضرت سلمیٰ کہ سلامت بادش　　　چہ شود گر بسلامی دل ما شاد کند

امتحان کن کہ بسی گنج مرادت بدهند　　　گر خرابی چو مرا لطف تو آباد کند

یا رب اندر دل آن خسرو شیرین انداز　　　کہ برحمت گذری بر سر فرہاد کند

کردیم ذو بخش تا بیاساید خلق
او زیر زمین گرفت من روی زمین[1]

سلطان اویس ایلکانی کی موت کے بعد اس کا بیٹا سلطان حسین باپ کی ولایات کی حکمرانی پر متمکن ہوا لیکن وہ تجربہ میں اپنے باپ سے بہت پیچھے تھا اور اس کے علاوہ سہل انگار بھی تھا۔ ۷۷۷ ہجری میں شاہ شجاع نے اپنی دیرینہ آرزو پوری کرنے کی غرض سے بھاری لشکر لے کر تبریز پر حملہ کیا۔ شاہ منصور اس لشکرکشی میں شامل تھا۔ اُس نے بڑی جوانمردی کا ثبوت دیا۔ سلطان حسن کی فوج شکست کھا کر پسپا ہوئی اور وہ خود کسی گمنام جگہ پر چھپ گیا۔ شاہ شجاع نے آذربائیجان کی حکومت کی باگ ڈور اپنے ...... ہاتھ میں لی اور چار مہینے تبریز میں عیش و عشرت میں گزارے۔ سلمان ساوجی نے اس موقعہ پر شاہ شجاع کی مدح اور تہنیت میں ایک طویل قصیدہ کہا۔

زہی دولت کز اقبال ہمایون چتر سلطانی ہمایون فال شد بومی کہ بود شہ سرلو برانی

تعجب ہے کہ سلمان ساوجی نے عمر بھر جلایری خاندان کی خدمت اور مدح گوئی کی جس کے عوض اُن سے بڑی عنایات پاتا رہا لیکن جب شاہ شجاع نے تبریز کو فتح کیا تو مندرجہ بالا قصیدہ اپنے قدیمی ممدوحین کے دشمن کی مدح میں کہہ ڈالا۔ کہتے ہیں کہ شاہ شجاع اس قصیدہ پر بہت خوش ہوا، اور خاص کر مطلع تو بہت پسند آیا۔

درج ذیل حافظ کی غزل کے بارے میں خیال ہے کہ یہ اس وقت کہی گئی تھی جب شاہ شجاع تبریز میں وارد ہوا تھا:۔

ای صبا گر بگذری بر ساحل رود ارس بوسہ زن بر خاک آن وادی و مشکین کن نفس

---

[1] تاریخ وصاف میں درج ہے کہ یہ دو بیتی سلطان محمود غزنوی نے اپنے بھائی مسعود کی موت پر کہی تھی فصیحی خوافی نے مجمل میں اس کو سلطان مسعود بن ملک شاہ سلجوقی سے نسبت دی ہے جس نے اسے اپنے بھائی محمود کی موت پر کہا تھا۔

کا ذکر تھا۔ تیمور نے شاہ شجاع کے سفیر کے ساتھ مہربانی کا سلوک کیا اور کئی تحفے دے کر واپس شیراز بھیج دیا اور اپنی طرف سے امیر حاجی خواجہ کو دوستی اور محبت کا پیغام دے کر شاہ شجاع کے دربار میں روانہ کیا۔ ضمناً دوستی کو مضبوط بنانے کے لیے شاہ شجاع کے خاندان کی ایک لڑکی کا رشتہ اپنے نواسہ امیر زادہ پیر محمد کے لیے مانگا جو شاہ شجاع نے منظور کیا۔ چنانچہ اس نے اپنی پوتی یعنی سلطان اویس کی بیٹی کو امیر تیمور کے دربار میں روانہ کیا۔ ۷۸۵ھ میں جب کہ شاہ شجاع ایران کے جنوب مغربی علاقوں میں سرگرم تھا۔ چند واقعات رونما ہونے کی بنا پر اُسے کافی صدمہ ہوا۔ اوّل یہ کہ اس کی ماں خان قتلغ خان کی وفات ہوئی۔ اور دوم یہ کہ اس نے سرمستی کی حالت میں اپنے بیٹے سلطان شبلی کی آنکھیں نکلوانے کا حکم صادر کیا۔ عاملوں نے فوراً اس حکم کی تعمیل کی۔ اگرچہ شاہ شجاع دوسرے ہی دن سخت پشیمان ہوا۔

فارس نامہ ناصری کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ شجاع کو اپنے بیٹے سے بدظن کیا گیا تھا۔ اس کی صحت ان صدمات کی بنا پر روز بروز بگڑتی گئی۔ سلطانیہ اور شوشتر کی مہموں سے واپس شیراز آنے پر اس نے بیشتر وقت مے نوشی اور شہوت رانی میں بسر کیا۔ اس سے اس کی صحت ابتر ہوتی گئی اور اب بستر پر ہی پڑا رہا۔ غرضیکہ اُسے اپنی قریب الوقت موت کا یقین ہونے لگا اور پھر آخرت کے سفر کا اہتمام بھی کرنے لگا۔ سرہانے دس قرآن خوان بٹھا دیئے جو ایک دن میں ختم قرآن کرتے تھے۔ مسکینوں اور ناداروں میں مال و غذا کی خیرات بانٹنے کا حکم دیا۔ درباریوں کو کثرت سے بلایا جانے لگا اور خود کفن دفن کی ہدایات دیتا رہا۔ لوگوں میں اس خبر سے اضطراب پھیلنے لگا اور وہ فتنہ و آشوب بپا کرنے لگے۔ لیکن شاہ شجاع نے اپنے بیٹوں، امراء کو بلا کر انھیں امن و آشتی سے رہنے کی تلقین کی جس کے قبضہ میں جو علاقہ تھا وہ اُسے تفویض ہوا، اور شاہ زین العابدین کو اپنا ولی عہد بنایا۔ اسی اثناء میں شاہ شجاع نے اپنے ہاتھ سے ایک خط تیمور کو لکھا

شاہ را بود از طاعت صد سالہ و زہد — قدر یک ساعتہ عمری کہ در و داد کند

حالیا عشوۂ ناز تو ز بنیادم برد — تا دگر بارہ حکیمانہ چہ بنیاد کند

گوہر پاک تو از مدحت ما مستغنی است — فکر مشاطہ چہ با حسن خداداد کند

رہ نبردیم بہ مقصود خود اندر شیراز
ہم آن روز کہ حافظ رہ بغداد کند

ظاہر ہے کہ اس غزل میں کہیں بھی سلطان احمد کا نام نہیں آیا ہے لیکن اس کے پانچویں شعر یعنی ۔ "شاہ را ․․․․ الخ سے پتہ چلتا ہے کہ حافظ کا روئے سخن اسی سلطان کی طرف ہوگا۔ مقطع کے بیت میں بھی بغداد کی طرف اشارہ ہے اور اگر ہمارا قیاس درست ہو تو ظاہر ہے حافظ نے یہ غزل زندگی کے آخری دور میں ہے کیونکہ سلطان احمد کے آذربائیجان کی حکومت سنبھالنے کے صرف آٹھ سال حافظ کی وفات ہوئی۔ غزل کی انتہائی شیرینی اور روانی سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شاعر کی زندگی کے آخری دور کی تخلیق ہوگی اس کے ایک شعر میں برابر وہی مضمون لایا گیا ہے جو سابقہ غزل کے ایک شعر میں آیا ہے یعنی فارس کی شکایت اور بغداد کے سفر کی آرزو۔

ہم سلطان احمد ایلکانی کو تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ کر پھر شاہ شجاع کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ فتح آذربائیجان کے بعد شاہ شجاع ایران کے جنوب مغربی علاقوں کی طرف متوجہ ہوا یعنی آہواز، شوشتر وغیرہ کی طرف، اس کے سرکار سے سرگرم عمل رہے۔ ۷۸۴ھ کے اہم واقعوں میں سے ایک واقعہ امیر تیمور گورکانی کا ظہور ہے۔ وہ کلات کی نواحی سے نکل کر ترشیز کی طرف عازم ہوا۔ یہاں اس نے قلعہ کا محاصرہ کیا اور اسی موقعہ پر شاہ شجاع کی طرف سے امیر عمر نام کا ایک سفیر شیراز سے چل کر امیر تیمور کی خدمت میں پہنچا۔ وہ اپنے ساتھ بے شمار تحفے تحایف لایا تھا اور شاہ شجاع کی طرف سے ایک خط امیر تیمور کی خدمت میں پیش کیا جس میں شاہ شجاع کے اظہار اخلاص و دوستی

رحمان لایموت چون آن پادشاہ را | کرد آنچنان کہ زعمل الخیر لا یفوت
جانش غریق رحمت خود کرد تا بود | تاریخ این معاملہ رحمان لایموت

رحمان لایموت سے ۷۸۶ ہجری اخذ ہوتا ہے۔

شاہ شجاع کی خوش رفتاری اور نیک اندیشی کی سب مورخین نے تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ وہ علم دوست دانش پرور بادشاہ تھا۔ ہمیشہ عالموں کی مجلسیں منعقد کرتا تھا۔ اور دانشمندوں کی باتوں سے حظ اٹھاتا تھا۔ امور مملکت داری میں بڑی سوجھ بوجھ سے کام لیتا تھا اور عیش پرستی اور مے نوشی کا دلدادہ تھا۔ اس کی شخصیت کی خوبیوں اور باقی سارے پہلوں پر تمام اہم مورخوں نے روشنی ڈالی ہے۔ ان میں شہاب یزدی (جامع التواریخ حسینی) ابن حجر عسقلانی (درر الکامنہ) معین الدین یزدی (مواہب الٰہی) محمود گیتی (تاریخ آل مظفر، حافظ ابرو (جامع التواریخ رشیدی) کے علاوہ تاج الدین احمد وزیر کے مجموعہ کا قلمی نسخہ بھی شامل ہے۔ ان سب مورخوں نے طویل اور پر تکلف عبارت میں شاہ شجاع کی تعریف و توصیف کی ہے۔ ہم باقی سب سے قطع نظر کر کے "روضۃ الصفا" کی عبارت سے چند جملات نقل کرتے ہیں جن سے اس کی خوبیوں کا اندازہ ہو سکے!

"..... شاہ شجاع بلطف طبع و حسن خلق و وفور فضل و زیور ادب و حلیہ تواضع وکمال مکرمت و طینت پاک و فرط جود و شیمۂ شجاعت متحلی بود و از جبن و بددلی و بخل و امساک و سایر اوصاف ذمیمہ و اعمال ردیۂ متخلی ..... و از ارتقاء بذروۂ علوم و معارف یقینیہ بدرجہ رسید کہ پیوستہ فضلاء دانشور و علماء فضل گستر کہ بمجلس ہمایونش راہ می یافتند از لطایف خاطر قدسی صفاتش محظوظ ..... حافظہ اش بغایتی بود کہ ہفت ہشت بیت عربی را بیک شنیدن یاد می گرفت"

تذکرہ نویسوں نے شاہ شجاع کے کئی اشعار اور قطعات کو اپنی تحریروں میں نقل کیا ہے۔

شرف الدین علی یزدی نے ظفرنامہ میں اس کی عبارت کو عیناً نقل کیا ہے۔ قبل از مرگ شاہ شجاع نے وصیت کی کہ اُسے شیراز کے باہر مصلی میں عارضی طور پر دفن کیا جائے اور کرمان سے امیر اختیار الدین حسن کے آنے پر میت کو اس کی نگرانی میں لے جاکر جوارِ قدس میں دفن کیا جائے۔ چنانچہ جنازے کے حمل و نقل، ملاحوں کی اُجرت اور مسکینوں اور ناداروں میں خیرات وغیرہ تمام نقلیں مرتب کی گئیں، اور سال ۷۸۶ھ میں شعبان مہینہ کی بائیسویں تاریخ کو فوت ہوکر چہل مقام یا چہل دختران پہاڑی کے دامن میں دفن کیا گیا۔ شاہ شجاع نے ۵۳ برس کی عمر پائی اور پچیس برس تک حکومت کرتا رہا۔

یہ معلوم نہیں کہ آیا اس کی خواہش پر عمل کر کے اس کی میت کو مدینہ منتقل کیا گیا تھا یا نہیں لیکن آج شیراز میں کوہ چہل مقام کے نزدیک "ہفت تنان" نام کی جگہ پر جو خواجہ حافظ کی آرام گاہ کے قریب ہی ہے ایک سنگ قبر ملا ہے جو تقریباً سو او دو میٹر لمبا اور ستر سینٹی میٹر چوڑا ہے۔ یہ کریم خان زند کے زمانے میں دستیاب شدہ آثار میں سے ہے اس پر کندہ شدہ عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ شجاع کی قبر پر رکھا گیا پتھر ہے اور بقول حافظ مادہ تاریخ "حیف از شاہ شجاع" سے نکلتا ہے[1] لیکن ڈاکٹر قاسم غنی کے مطابق یہ مادہ تاریخ قطعی حافظ کا کہا ہوا نہیں ہے۔ دیوان حافظ میں شاہ شجاع کی وفات سے متعلق کہا گیا   مادۂ تاریخ میں قطعہ عیناً وہی ہے جو حافظ ابرو جغرافیائی میں درج کیا ہے۔ یعنی:

---

[1] یہ عبارت   ۱۱۵۲ میں اس پر کندہ کروائی گئی تھی۔ چنانچہ میرزا محمد کرمانی جو کریم خان زند کا منشی تھا، اس بات کی اطلاع دیتا ہے کہ سنگ مزار کریم خان زند کے حکم سے بنوایا گیا تھا۔ اطلاع کے لیے رجوع ہو "نسخہ خطی خلاصۃ العلوم" متعلق بہ کتابخانہ عباس اقبال۔ تہران

شاہ شجاع کی شاعرانہ صلاحیت کی توصیف میں مورخوں نے مبالغہ سے کام لیا ہے۔ اس کے کلام کے نمونہ سے جو ہمارے سامنے ہے یہی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے اشعار سست اور بعض اوقات بے مزہ ہیں۔ بہرکیف وہ اس قدر علم دوست اور سخن فہم ضرور تھا کہ حافظ نے اس کی تعریف اور مدح کی ہے۔ شاہ شجاع سے متعلق حافظ کی غزلوں۔ قصیدوں اور قطعات وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ کو اس بادشاہ سے محبت تھی اور طویل مدت تک اس کا ہمعصر ہونے کی بنا پر اس کا احترام کرتا تھا۔ شاہ شجاع ۷۵۴ ہجری میں پہلی بار شیراز آیا۔ اس وقت وہ اکیس برس کا نوجوان تھا اس کی وفات ۷۸۶ ہجری میں ہوئی گویا شاہ شجاع اور حافظ بتیس برس تک ہمعصر رہے۔ اگر حافظ کا سال تولد ۷۱۰ ہجری فرض کریں تو ۷۵۴ ہجری میں جب وہ پہلی بار شاہ شجاع سے متعارف ہوئے ہوں گے اُس وقت ان کی عمر ۴۴ برس کی تھی اور شاہ شجاع کی وفات کے وقت وہ انہتر (۶۹) برس کے پیر مرد ہوں گے اگر حافظ کی عمر کے پہلے پچیس سال کسب علم و ہنر میں صرف ہوئے ہوں... تو باقی عمر کے پچاس سال جو ان کی شعر و شاعری کا زمانہ تھا، اس میں سے بتیس سال شاہ شجاع کے دورسے متعلق ہیں۔ اس قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعرانہ زندگی کا دو تہائی حصہ شاہ شجاع کے عہد سے وابستہ ہے۔ دیوان حافظ میں تقریباً ۱۲۳ بار بادشاہ کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ ایک سو نو غزلوں۔ گیارہ قطعوں۔ ایک مثنوی اور دو قصیدوں میں سلطان خسرو۔ بادشاہ۔ شہنشہ۔ شاہنشاہ۔ دپادشاہ۔ شہریار۔ شاہ۔ ملک۔ فرمانده۔ داد گر وغیرہ کے عنوانوں سے بادشاہ وقت کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ ان میں سے کم از کم ستر بار صراحت سے یا اطمینان بخش قرائن سے شاہ شجاع کی طرف اشارہ ہوا ہے یا اس کے علاوہ حافظ کے ہمعصر شاہزادوں اور حکمرانوں کا نام بھی آیا ہے۔

اس کے خطوط کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فنِ انشار کے رموز سے بخوبی آشنا تھا۔ چنانچہ ملک الشعراء بہار نے سبک شناسی میں حافظ کے دور کی فارسی نثر کے اعلیٰ نمونے کے لیے شاہ شجاع کے ایک خط کے اقتباس کو پیش کیا ہے۔ شاہ شجاع کا دیوان یا اُس کے پراگندہ اشعار کو سعد الدین انسی نے جمع کیا اور پھر تذکرہ نویسوں نے بھی کہیں کہیں درج کیا۔ فارسی کے علاوہ اس نے عربی میں بھی بڑی مہارت حاصل کی تھی۔ شاہ شجاع اور حافظ کی کئی غزلیں ردیف۔ قافیہ اور جہت مضمون کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مشابہت رکھتی ہیں۔

	حافظ	شاہ شجاع
۱۔	ہاتفی ازگوشہ میخانہ دوش گفت ببخشند گنہ می بنوش	شیوۂ عشاق نباشد خروش گر بشل خون دل آید بجوش
۲۔	منم کہ دیدہ بدیدار دوست کردم باز چہ شکر گویمت ای کارساز بندہ نواز	بہر طریق کہ پیش آیدت نشیب و فراز تراز وصل من ای کارساز بندہ نواز
۳۔	ای رخت چون خلد و لعلت سلسبیل سلسبیلت کردہ جان و دل سبیل	ای بکام عاشقان حسنت جمیل کی گزینند بی دلی بہ تو بدیل
۴۔	دلم جز مہر مہرویان طریقی بر نمیگیرد ز ہر در میدہم پندش ولیکن در نمیگیرد	چہ شد جانان بدین گرمی کہ سوزم در نمیگیرد مگر فریاد مہجوران ترا در سر نمیگیرد

(نقل از مجموعہ تاج الدین احمد وزیر صفحہ ۱۳۹)

۲- رواق منظر چشم من آشیانۂ تست   کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست

۳- دلم جز مہر مہرویان طریقی بر نمیگیرد   ز ہر در میدہم پندش ولیکن در نمیگیرد

۴- دیدم بخواب خوش کہ بدستم پیالہ بود   تعبیر رفت و کار بدولت حوالہ بود

۵- در عہد پادشاہ خطا بخش جرم پوش   حافظ قرابہ کش شد و مفتی پیالہ نوش

۶- ای رخت چون خلد و لعلت سلسبیل   سلسبیلت کردہ جان و دل سبیل

۷- ای قبای پادشاہی راست بر بالای تست

زینت تاج و نگین از گوہر والای تست

۵- زین العابدین بن شاہ شجاع

مرنے سے پہلے شاہ شجاع نے اپنے بیٹے زین العابدین کو اپنا جانشین اور فارس کا بادشاہ بنایا تھا۔ ہر چند اُس نے دم نزع اپنے بیٹوں کو بلا کر انھیں باہمی جنگ و جدل سے اجتناب کرنے کی تلقین کی تھی، مگر ساری نصیحتیں بیکار گئیں، اور اس کی موت کے ساتھ ہی جیسے کہ متوقع تھا باہمی کشمکش کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا۔ اس وقت زین العابدین کے علاوہ دو اور شخصوں کے نام لیے جائیں گے جو میدان کشمکش میں وارد ہوئے۔ یعنی شاہ شجاع کا بھتیجا اور داماد نصرت الدین شاہ یحیٰی اور دوسرا بھتیجا شاہ منصور۔ شاہ یحیٰی

گزشتہ اوراق میں ہم نے ایک دو بار ان قصیدوں اور قطعوں کا ذکر کیا ہے جو حافظ نے شاہ شجاع سے مربوط کئے ہیں۔ اب ہم ایسی غزلوں کا حوالہ دیں گے جن میں کئی بار صراحت اور وضاحت سے حافظ نے شاہ شجاع کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا ہوگا کہ شاہ شجاع کے دیگر معاصر شعرا نے بھی اس کی مدح کی ہے جن میں خاص کر عماد فقیہ شامل ہے۔ سب سے پہلی غزل جس میں حافظ نے ابوالفوارس کا لقب بھی استعمال کیا ہے، قبل درج ہو چکی۔ مطلع یوں ہے:

ستارہ ای بدرخشید و ماہ مجلس شد — دل رمیدۂ ما را رفیق و مونس شد

باقی غزلوں کے مطلع ترتیب سے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:۔

۱۔ ہاتفی از گوشۂ میخانہ دوش — گفت ببخشند گنہ می بنوش

۲۔ قسم بحشمت جاہ و جلال شاہ شجاع — کہ نیست باکسم از بہر مال و جاہ نزاع

بفر دولتِ گیتی فروز شاہ شجاع — کہ ہست در نظر من جہان خیر متاع

۴۔ بامدادان کہ ز خلوت گہ کاخ ابداع — شاہ خاور فگند بر ہمہ اطراف شعاع

ذیل میں ہم ایسی غزلوں کے مطلع درج ہیں جن کے بارے میں قرائن کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ شاہ شجاع کی مدح میں ہیں۔

آن شبِ قدرے کہ گویند اہل خلوت امشب است

یارب این تاثیر دولت از کدامین کوکب است

سحر با بادمی گفتم حدیث آرزومندی

خطاب آمد که واثق شو بالطاف خداوندی

اسی غزل کے مقطع کا وہ مشہور شعر ہے جس کے بارے میں محققوں اور ناقدوں کے درمیان بے نتیجہ بحث اب تک جاری ہے۔ یعنی:

بہ شعر حافظ شیراز می رقصند و می نازند

سیہ چشمان کشمیری و ترکان سمرقندی

حاج محمد نخجوانی کے پاس دیوان حافظ کا ایک قلمی نسخہ ہے جو موجود قلمی نسخوں میں قدیم ترین خیال کیا جاتا ہے۔ چونکہ اس نسخہ کی کتابت ۸۰۳ ہجری یعنی حافظ کی وفات کے صرف گیارہ برس بعد ہوئی ہے، اس لیے عین ممکن ہے کہ حافظ کی کچھ غزلیں اس کی زندگی ہی کے دوران اس پر درج کی جا چکی ہوں۔ اس میں زیر نظر غزل کا مقطع یوں دکھایا گیا ہے:

بخوبان دل مده حافظ ببین آن بیوفائیہا

کہ با خوارزمیان کردند ترکان سمرقندی

خوارزمیوں کو ترکوں کے ہاتھوں کیا کچھ دیکھنا پڑا تاریخ میں تفصیل سے درج ہے۔ کیا یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہوگا کہ درحقیقت حافظ نے مقطع کو ابتدا میں اسی طرح کہا تھا جس طرح آقای نخجوانی کے نسخہ میں آیا ہے اور بعد میں اس کو بدل دیا گیا۔ حافظ کے قریب العصر مورخ عبدالرزاق سمرقندی نے مطلع السعدین و مجمع البحرین میں ۸۷۲ھ ہجری کے حوادث کے دوران لکھا ہے کہ خواجہ حافظ نے مقطع کے اس بیت یعنی " بخوبان دل مده حافظ........الخ کو ۷۸۱ ہجری کے وسط میں امیر تیمور کے ہاتھوں خوارزم کی فتح اور اس آباد شہر کی بربادی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ چنانچہ اس کی عبارت عیناً یوں ہے:

"..... بطرفۃ العینی شہر خوارزم مسخر شد و خزائن و دفائن چندین سالہ اولاد

نے فارس اور اصفہان کو مسخر کرنے کے عزم سے بھاری فوج جمع کر لی۔ پہلے تو اصفہان کے لوگوں نے اس کا خیر مقدم کیا، لیکن جلد ہی وہ اُس سے کبیدہ خاطر ہوئے اور رفتہ رفتہ سرپیچی کرنے لگے۔ اصل وجہ یہ تھی کہ شاہ یحییٰ تند خو ممسک اور سفاک آدمی تھا۔ اس میں مبارزالدین کی تمام بری خصلتیں جمع ہو گئی تھیں۔ ادھر شاہ منصور کو کازرون اور اس کی نواحی کی سرداری ملی تھی۔ زین العابدین کے خلاف ایک بار ان دونوں بھائیوں نے سازش کر کے لشکر کشی کا ارادہ کیا۔ لیکن قبل ازیں کہ وہ کسی سنگین عمل کے مرتکب ہوتے شاہ یحییٰ نے زین العابدین سے صلح کی درخواست کی، اور زین العابدین .... کی .... فوجیں شاہ منصور کی فوجوں کے ساتھ برسرِپیکار ہوئیں۔

البتہ زین العابدین نے کازرون کی خوشحالی کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ کیوں کہ شاہ منصور نے اس شہر کو غارت کیا تھا۔ آخر کار زین العابدین فاتحانہ انداز میں شیراز واپس چلا آیا۔

"مطلع السعدین" اور "روضۃ الصفا" میں اس تاریخی واقعہ کا ذکر کرتے درج ہوا ہے کہ زین العابدین کی فاتحانہ واپسی پر شمس الدین حافظ نے یہ غزل کہی:۔

خوش کرد یاوری فلک روز داوری

تا شکر چون کنی و چہ شکرانہ آوری

مطلع السعدین کی عبارت عیناً یوں ہے:

"اکابر و ارا الملک فارس باستقبال بارگاہ آسمان اساس آمدند و مراسم نثاری بجای آوردہ تہنیت این وفتح نامدار گفتند۔ مولانا شمس الدین حافظ گوید خوش کرد ... الخ"

ڈاکٹر قاسم غنی کہتا ہے کہ مندرجہ دو غزلیں بھی اسی زین الدین کی طرف اشارتاً کہی گئی ہیں۔ اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ کس وقت یا کس واقعہ کے پس منظر میں کہی گئی تھیں۔

مؤرخوں نے متفق ہو کر لکھا ہے کہ اصفہان کے لوگ اس کے سلوک سے خوش نہ تھے کیونکہ وہ یزد کی ترقی سے زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔ اصفہان میں جو بھی کوئی نفیس اور عمدہ چیز نظر آتی وہ یزد بھیج دیتا۔ اس کے مقابلے میں سلطان زین العابدین کریم اور فراخ دل بادشاہ تھا جب اس کی فوجیں اصفہان کی گرد و نواح میں پہنچ گئیں تو وہاں کے امام اور مقتدی خواجہ امام الدین نے اعلان کیا کہ جو کوئی سلطان زین الدین کی فوج پر ایک بھی تیر چلائے وہ گنہگار ہوگا۔

تعجب ہے کہ شاہ یحییٰ کے اس قدر بخیل اور حریص ہونے کے باوجود حافظ نے کئی غزلوں میں صراحت سے نام لے کر اس کی تعریف کی ہے۔ اس عجیب حقیقت پر ضرور کچھ روشنی ڈالنی چاہیئے۔ یہ تو درست ہے کہ حافظ نے شاہ یحییٰ کی تعریف کی، لیکن معلوم نہیں ایسی غزلیں کس وقت کہی گئی تھیں۔ کیا شاہ شجاع کے ساتھ اس کی خصومت کے ایام میں کہی گئی تھیں، یا اس وقت جب حافظ شیراز سے نکل کر یزد گئے تھے۔ ان سوالوں کا کوئی تسلی بخش جواب ملنا بہت مشکل ہے۔ حافظ کا ایک قطعہ بھی ہے جس میں شاہ یحییٰ کے بخل کی طرف خفیف اشارہ ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ نے کسی خاص اور وقتی مطلب کے لیے اس کی تعریف کی ہو۔ شاید مالی مشکلات میں گرفتار ہو کر اس امید سے یزد گیا ہو کہ شاہ یحییٰ کی طرف سے کوئی خاطر خواہ مدد مل سکے لیکن ناامید ہو کر واپس آ گئے۔ یہ شکایت ایک اور غزل میں بھی ملاحظہ ہوگی۔ بہر حال ہم ان تمام غزلوں کا حوالہ دیں گے جن میں صریحاً نصرت الدین شاہ یحییٰ کا نام آیا ہے:

۱۔ یک دو جامم دی سحرگہ اتفاق افتادہ بود   وز لب ساقی شرابم در مذاق افتادہ بود

۲۔ دارای جہان نصرت دین خسرو کامل   یحییٰ بن مظفر ملک عالم عادل

۳۔ دانی کہ چیست دولت دیدار یار دیدن   در کوی او گدائی بر خسروی گزیدن

امیر بایکمود بدست لشکر منصور افتاد و تخریب عمرانات وانواع بیداد در آن خطہ روی داد۔ چون بلاد خوارزم موطن صنادید عالم و مسکن نحاریر بنی آدم بود آوازہ خرابی آنچنان در اطراف جہان اشتہار یافت کہ بلبل دستانسرای مولانا حافظ در گلشن شیراز باین زمزمہ آواز آورد کہ:۔

بخوبان دل مدہ حافظ ببین آن بی وفائیہا
کہ با خوارزمیان کردند ترکان سمرقندی"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ نے ابتداء میں مقطع کے بیت کو ...... اسی طرح لکھا تھا جس طرح حاج محمد نخجوانی کے قلمی نسخہ میں درج ہوا ہے لیکن شاید امیر تیمور کے فارس میں داخل ہونے کے بعد اُس نے مصلحتاً بدل دیا، تاکہ کہیں اشرار اس شعر کو بہانہ بنا کر موجب زحمت نہ بن جائیں۔ ایک اور قیاس یہ ہے کہ شاید تیموری لشکر کے ساتھ کچھ کشمیری سپاہی یا اہل حرفہ شامل تھے جو حافظ کے لیے اس شعر کے محرک ہوئے۔

۲۔ دوسری غزل جس کا اشارہ زین العابدین کی طرف ممکن ہے، بہت مشہور غزل ہے یعنی ۔

اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل ما را
بخال ہندویش بخشم سمرقند و بخارا را

ملا سودی نے "ترک شیرازی" کی تشریح میں لکھا ہے کہ بعض شیرازیوں کا قول ہے کہ ہلاکو کے سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد نے شیراز میں سکونت اختیار کی تھی اور وہاں تولید نسل کرتے رہے، پس ان کی اولاد کو ترک شیرازی کہا جانے لگا۔ لہذا ترک شیرازی نہ تو تشبیہ ہی ہے اور نہ استعارہ۔ بلکہ وہ ترک ہے جو شیراز میں سکونت پذیر تھا۔ سودی لکھتا ہے کہ ترک فطرۃً خونخوار، ظالم اور بے رحم ہوتے ہیں۔ ایران کے شاعروں نے معشوق کو سنگدل اور بے رحم کہہ کر ترک قوم سے مشابہ کرنے کی عادت ڈالی۔

نصرت الدین شاہ یحیی شاہ شجاع کا بھتیجا اور داماد تھا یعنی سلطان پادشاہ کا شوہر۔

عیال پر دست اندازی کرنی چاہی۔تیمور نے قتل عام کا حکم دیا۔ اور لگ بھگ ستر ہزار آدمیوں کو لقمۂ اجل بنایا گیا۔ اُن کی کھوپڑیاں ایک مینار کی شکل میں ڈھیر لگوائی گئیں۔ اس دلخراش واقعہ کی پوری تفصیل ظفر نامہ میں درج ہے۔ اصفہان کے قتل عام کا سانحہ حافظ کی عمر کے آخری دور میں رونما ہوا۔ ظاہر ہے اس انسان کش سفاکی کا صدمہ انھیں بھی ہوا ہوگا۔ قتل عام کی خبر ملک کے اطراف و اکناف میں پھیل گئی۔ شیراز میں لوگ دہشت زدہ ہوئے۔ سلطان زین العابدین نے اپنے کچھ امراء اور فوج کی ایک ٹکڑی کو لے کر شوشتر کی راہ لی تاکہ پیش قدمی کرتے ہوئے بغداد کی طرف نکل جائے۔ ادھر کرمان کے سلطان احمد نے تیمور کی اطاعت قبول کی۔ اور حملہ آور فوجیں شیراز کی طرف بڑھ کر شہر میں داخل ہو گئیں۔ زیادہ دن نہ ہوئے کہ سمرقند سے بغاوت کی خبر موصول ہوئی اور شیراز سے کوچ کرنے سے پہلے تیمور نے فارس، عراق اور کرمان کی حکومتوں کو مظفری خاندان کے شہزادوں میں بانٹ دیا۔ شاہ یحییٰ کو شیراز کی حکومت ملی، اور اس کے بیٹے سلطان محمد کو اصفہان کی۔

دیوان حافظ کے بعض قلمی نسخوں میں ایک قطعہ پایا جاتا ہے جس میں تیمور کے فارس پر تسلط کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ ایسا ایک قلمی نسخہ تہران کے کتاب خانۂ ملی میں موجود ہے۔ اس کے کاغذ اور طرز خط سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نسخہ گیارھویں صدی ہجری میں لکھا گیا تھا۔ قطعہ یہ ہے:

چشم گشا قدرت یزدان ببین	نیم تنی ملک سلیمان گرفت
دست نہ و ملک جز بہ نگین	پای نہ و چنگ فلک زیر ران
نیست کہ گوید کہ چنان یا چنین	این ہمہ ادمی کشد او سید بہ

ابن عرب شاہ نے اپنی تاریخ "عجائب المقدور فی نوائب تیمور" میں اس قطعہ کو ایک دلچسپ قصے کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ گو اس کا درج کردہ قطعہ بھی مندرجہ بالا

۴۔ در سرای مغان رفته بود و آب زده   نشسته پیر صلائی بہ شیخ و شاب زده

۵۔ ایکہ بر ماہ از خط مشکین نقاب انداختی   لطف کردی سایہ ای بر آفتاب انداختی

ذیل میں درج حافظ کی ایک مشہور غزل میں قرائن کی بنا پر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ بھی شاہ یحیٰی کی طرف رجوع کرتی ہے۔ اس کے پس منظر میں پھر وہی بات دہرائی جا سکتی ہے جو ہم نے گزشتہ سطور میں کہی۔ یعنی یہ کہ حافظ اپنے شہر سے دور یزد کے سفر کا شوق رکھتے تھے شاہ یزد کا نام لے کر اس کی اور یزد کے لوگوں کی ثنا خوانی کرتے ہیں۔ لطیف پیرایہ میں مالی مدد کی درخواست کرتے ہیں۔ وغیرہ۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ممدوح کی تعریف حافظ نے محبوب۔ معشوق۔ بت۔ جان وغیرہ جیسے الفاظ سے کی ہے اور زیر نظر غزل میں بھی یہ روش برقرار رکھی گئی ہے مثلاً:۔

ای فروغ ماہ حسن از روی رخشان شما   آبروی خوبی از چاہ زنخدان شما

ادھر مظفری شہزادے باہمی رقابت اور عناد میں گرفتار ہوتے جا رہے تھے اور ادھر تیمور کا عفریتی سایہ پھر خاک ایران پر پھیلتا جا رہا تھا۔ ۷۸۸ھ یا بقول مطلع السعدین تاریخ جغرافیائی ۷۸۹ھ میں امیر تیمور نے بتدریج ماوراء النہر اور ترکستان کے بڑے حصہ کو قبضہ میں کیا۔ اسی سال اس نے آذربایجان سے ایک قاصد زین العابدین کے پاس بھیجا کہ میری اطاعت قبول کرو کیونکہ شاہ شجاع نے مرتے وقت اُسے (زین العابدین) میرے سپرد کیا تھا۔ زین العابدین نے کوئی جواب نہ دیا، اور نہ ہی قاصد کو واپس جانے کی اجازت دی۔ امیر تیمور اس برتاؤ سے غضبناک ہوا، اور ہمدان سے فارس کی طرف چل پڑا۔ اصفہان پہنچ کر زین العابدین کے ماموں مظفر کاشی نے عمائدین شہر کو لے کر اس کا استقبال کیا اور دروازوں کی چابیاں پیش کیں۔ تیمور نے اصفہانیوں کو پہلے تو امان کا وعدہ دیا، لیکن دوسرے ہی دن بعض شہریوں اور تیموری لشکریوں کے درمیان جھگڑا ہوا۔ غالباً لشکریوں نے اہل شہر کے

اس کے بارے میں فارسی کے دو شعر کہے گئے ہیں:

نیم تنی ملک سلیمان گرفت　　چشم گشا قدرت یزدان ببین

پای نہ و تخت بہ زیر زمین[1]　　دست نہ و ملک بزیر نگین

یہاں ایک بار پھر اُس قصّہ کی طرف رجوع کیا جائے گا جو تیمور اور حافظ کے درمیان اس شعر سے مشہور ہے:

اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل مارا

بخال ھندویش بخشم سمرقند و بخارا را

اس حکایت کا آغاز دولت شاہ سمرقندی کے تذکرہ سے ہوا ہے اور بعد کے مورخوں نے اسی تذکرہ نویس سے نقل قول کیا ہے۔ پروفیسر براؤن کو دولت شاہ سمرقندی کا نہ صرف یہ قصّہ بلکہ اور بھی کئی اہم معلومات اور بیانات کی صحت پر شک ہوا ہے۔ کیونکہ دولت شاہ بڑی لاپروائی کا شکار ہوتا رہا ہے۔ بہرحال اگر یہ داستان درست بھی ہو تو ظاہر ہے کہ ۷۸۹ ہجری میں ہی یہ اتفاق ہوا ہوگا نہ کہ ۷۹۴ ہجری میں، جیسے کہ دولت شاہ نے لکھا ہے۔ آقای عباس اقبال کے پاس علی بن الحسین واعظ کاشفی کی تالیف "لطایف الطوایف" کا ایک ذاتی قلمی نسخہ ہے جس کی استنساخ ۱۲۶۷ ہجری میں ہوئی تھی۔ اس کے نویں باب میں "لطایف شعرا دبدیہہ گفتن" کے عنوان کے تحت یہ عبارت درج ہے:

---

[1] یہ مصرع غلط معلوم ہوتا ہے۔

"... چوں امیر تیمور ولایت فارس را مسخر کرد و بشیراز آمد و شاہ منصور را کشت خواجہ حافظ شیرازی را طلبید و او ہمیشہ منزوی بود و بہ فقر و فاقہ می گذرانید۔ سید نورالدین جنابذی[2] کہ نزد امیر تیمور قربی تمام داشت و مرید خواجہ حافظ بود۔

[2] اس وزیر کا نام مجمل فصیحی میں آیا ہے۔ سال ۸۲۶ ہجری کے حوادث کے ضمن میں فصیحی نے لکھا ہے:

"دارائی وزارت دیوان حضرت اعلیٰ خاقانی بہ مرتضیٰ اعظم سید زین الدین بن سید نظام الدین محمد الجنابذی و خواجہ نظام الملک جعفر تبریزی لبشہر گشت"

متن سے قدرے مختلف ہے۔ چونکہ عرب شاہ کی تیمور کی تاریخ بڑی مستند ہے اس لیے ہم قصہ کو قارئین کی تفریح کے لیے یہاں درج کرتے ہیں:۔

"مولانا محمود الحافظ الجرق الخوارزمی اپنے وقت کا مشہور گویا اور موسیقی دان تھا اس نے مجھے (عرب شاہ) مندرجہ ذیل حکایت سنائی۔ امیر تیمور نے ایک سفر میں مجھے (حافظ الخوارزمی) اپنا مصاحب بنایا۔ میں دن رات اس کی خدمت میں حاضر رہا کرتا تھا۔ ایک بار اس کی فوج نے کسی قلعہ کا محاصرہ کیا۔ تیمور کا خیمہ اونچی جگہ نصب ہوا تھا تاکہ وہ میدان جنگ اور اس کے آس پاس کے علاقہ پر اپنی نظر دوڑا سکے اس دن خونریز جنگ ہو رہی تھی۔ میرے علاوہ اور دو آدمی اُس کے سامنے حاضر تھے۔ تیمور بخار میں مبتلا اور بہت نڈھال اور غمگین تھا۔ اس جسمانی کمزوری کے باوجود میدان جنگ کا حال اپنی آنکھ سے دیکھنا چاہتا تھا حکم دیا کہ اُسے ایک دروازے پر لاکر رکھا جائے۔ میں بھی اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ دو آدمیوں نے سہارا دے کر اس کو اُٹھائے رکھا تھا، تاکہ میدان جنگ کا عینی مشاہدہ کر سکے۔ اتنے میں ایک آدمی کو کسی کام سے بھیجا گیا اور اس کی جگہ میں نے تیمور کو سہارا دیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے نیچے بٹھانے کو کہا، کیونکہ ضعف سے گویا بے جان ہوا جا رہا تھا۔ دوسرا آدمی بھی کسی کام سے چلا گیا اور میں اکیلا اس کے پاس حاضر رہا۔ اُس وقت اس نے کہا میری کمزوری اور جسم کی ناتوانی کو دیکھو۔ نہ میرا ہاتھ ہے کہ کسی چیز کو پکڑ سکوں اور نہ پاؤں کہ بھاگ سکوں۔ اگر کوئی مجھ پر تیر چلائے تو میں ہلاک ہو جاؤں گا۔ تھوڑی دیر تک سوچ میں ڈوبا رہا اور پھر بولا، دیکھو خدا نے کس طرح لوگوں کو میرا مقہور بنایا اور شہروں کے شہر میرے قبضہ میں دیے۔ میری ہیبت مشرق سے مغرب تک پھیل گئی۔ کتنے ہی جابر بادشاہوں کو میں نے مطیع بنایا۔ کیا یہ خدا کے احکام نہیں ہیں؟ کیا میں ایک محتاج انسان سے کچھ زیادہ ہوں؟" اس کے بعد اس نے زار زار رونا شروع کیا۔ حتیٰ کہ میرا لباس تر ہوا، اور مجھے بھی رونا آیا۔"

آگے چل کر عرب شاہ لکھتا ہے کہ ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تیمور جبر کا قائل تھا اور

ہم پھر اصل موضوع کی طرف رجوع کریں گے۔ شاہ شجاع کے جانشین نالائق نکلے اور اور باہمی جنگ و جدل میں اُلجھ کر کمزور ہوتے گئے۔ سلطان زین العابدین بڑا خیرہ دبیر اور بداحتیاط بادشاہ ثابت ہوا۔ اگرچہ شاہ یحییٰ کے مقابلہ میں کسی قدر سخی تھا لیکن ایک مضبوط حکومت سنبھال کرنے کے لیے صرف سخی اور کریم ہونا ہی کافی نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تمام فارس اور بخصوص شیراز طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا ہوئے۔ لوگ قحط اور وبا کے شکار ہوئے اور مال و جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ایسے حالات میں کوئی تعجب نہیں حافظ وقت کے حکمرانوں سے آزردہ خاطر ہوئے ہوں۔ چنانچہ انھوں اپنی زندگی کے بیشتر اور اہم حصہ میں زبردست سیاسی اور اجتماعی تبدیلیاں دیکھیں، جن میں آئے دن ایک گروہ کی شکست اور دوسرے کی کامیابی کا سامان ہوتا۔ ہر تبدیلی عوام کی زندگی میں مشکلات کا اضافہ کرتی۔ زندگی کے آخری دور میں تو حافظ طاقت فرسا اور صبر شکن سیاسی اوضاع کی بنا پر ناامید ہو گئے تھے۔ اس لیے کوئی تعجب نہیں کہ انھوں نے طوائف الملوکی کے شرمناک دور کے خاتمے یا قلع قمع کی صدق دلی سے آرزو کرتے ہوئے دل ہی دل میں امیر تیمور جیسے قہار بادشاہ کے ذریعہ حالات میں سدھار کی اُمید قایم کی ہو۔ قاسم غنی نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے اور اضافاً مندرجہ ذیل غزل کو بطور دلیل پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ غالباً ۷۸۶ یا ۷۸۸ ہجری کے درمیان کہی گئی ہوگی جو شاہ شجاع کی وفات اور امیر تیمور کے آذربائیجان کو مسخر کرنے کے درمیان کا زمانہ ہے:

سینہ مالامال درد است ای دریغا مرہمی

دل ز تنہائی بجان آمد خدا را ہمدمی

لیکن یہ حافظ کی خوش فہمی تھی جس کا احساس جلدی اور کسی ضرر کے پہنچنے سے پہلے ہی ہوا۔ تیمور کی سرداری سے حالات میں کوئی خاطر خواہ بہتری نظر میں نہ آئی، بلکہ اس کے برعکس اس نے اصفہان میں قتل عام کا حکم دے کر انسان دشمنی کا پورا ثبوت دیا۔ فارس کے لوگ دہشت زدہ ہو گئے، اور ظاہر ہے کہ خواجہ صاحب کو اپنے ہمشہریوں اور ہمخیالوں کی طرح

را بملازمت امیر تیمور آورد۔ امیر دید کہ آثار فقر و ریاضت بر و ظاہر است گفت ای حافظ من بضربت شمشیر تمام روی زمین را خراب کردہ تا سمرقند و بخارا را معمور کردم و تو آن را بیک خال ہندی بخشی؛
اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل ما را

بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

خواجہ حافظ گفت کہ ازین بخشش گیہا ست کہ بدین فقر و فاقہ افتادہ ام۔ امیر تیمور خندید و برای حضرت خواجہ وظیفہ لایق تعیین کرد۔"

اس داستان کی تردید کے لیے بظاہر ہمارے پاس کوئی زوردار دلیل نہیں۔ اس لیے ممکن ہے کہ حافظ اور تیمور کے درمیان ملاقات کے وقت شعر مذکور زیر نظر لایا گیا ہو۔ ہم نے پہلے بھی ایک جگہ بتایا ہے کہ ترک شیرازی سے خواجہ صاحب کا اشارہ زین العابدین کی طرف ہو سکتا ہے، کیونکہ وہ اپنے باپ کی طرف سے ترک نسل کا تھا۔ "شیرازی" کی رعایت سے "ہندو ریش" سمرقند اور بخارا لایا گیا ہے۔ علم معانی میں حافظ جس لطیف پیرایہ میں صنعت مراعات النظیر جناس اور ایہام کو استعمال میں لائے ہیں اس کی کم مثالیں مل سکتی ہیں۔

شاہ شیخ ابو اسحاق اینجو کے خاندان کے ایک شخص شجاع شیرازی نے "انیس الناس" نام کا ایک رسالہ ۸۳۰ھ کے آس پاس امیر تیمور کے پوتے مغیث الدین ابو الفتح ابراہیم بن شاہرخ سلطان کے لیے لکھا تھا۔ کلیلہ و دمنہ اور قابوسنامہ کی طرح اخلاقیات و ریاست منزل کے موضوعات پر رسالہ ہے۔ اس کی ایک حکایت میں حافظ اور تیمور کے درمیان اس بیت کے بارے میں سوال و جواب کا اشارہ ملتا ہے۔ شرح احوال حافظ کے دوران ہم نے اس حکایت کو درج کیا ہے، اس لیے تکرار سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ اس حکایت سے البتہ ایک نئی بات کا پتہ چلتا ہے۔ یعنی یہ کہ شیراز پر تسلط جمانے کے بعد اہل شیراز پر ٹیکس لگایا گیا اور ٹیکس ادا کرنے والوں کی فہرست میں حافظ کا نام بھی شامل کیا جا چکا تھا۔ اس سے چھٹکارا پانے کے لیے حافظ نے امیر تیمور سے ملاقات کی راہ نکالی۔

شاہ منصور کے شیراز پر تسلط جمانے اور شاہ یحییٰ کا بغیر کسی مدافعت و مقاومت شیراز ترک کر کے یزد چلے جانے کے سلسلے میں غالباً مندرجہ ذیل غزل کہی گئی تھی۔

بیا کہ رایت منصور پادشاہ رسید — نوید فتح و بشارت بمہر و ماہ رسید

جمال بخت ز روی ظفر نقاب انداخت — کمال عدل بفریاد داد خواہ رسید

سپہر دور خوش اکنون کند کہ ماہ آید — جہان بکام دل اکنون رسد کہ شاہ رسید

ز قاطعان طریق این زمان شود ایمن — قوافل دل و دانش کہ مرد راہ رسید

عزیز مصر برغم برادران غیور — ز قعر چاہ برآمد باوج ماہ رسید

کجاست صوفی دجال چشم ملحد شکل — بگو بسوز کہ مہدی دین پناہ رسید

صبا بگو کہ چہا بر سرم درین غم عشق — ز آتش دل سوزان و دود آہ رسید

ز شوق روی تو شاہا بدین اسیر فراق — همان رسید کہ آتش ببرگ کاہ رسید

مرو بخواب کہ حافظ ببارگاہ قبول
ز ورد نیم شب و درس صبحگاہ رسید

تھوڑی دیر کے لیے ہم اصل موضوع سے ہٹ کر اس غزل کے چھٹے شعر کی طرف متوجہ ہوں گے جس میں "صوفی دجال چشم ملحد شکل" کی اصطلاح لائی گئی ہے۔ اس کا اشارہ امیر تیمور کی طرف ہے۔ اکثر مورخوں نے لکھا ہے کہ تیمور صوفی مشایخ اور خانقاہوں کے مجاوروں سے عقیدت کا اظہار اور ان سے دعا و ہمت کی درخواست کرتا تھا۔ اس خیال کی بنیاد مضبوط ہے۔ مثلاً شرف الدین علی یزدی نے ظفر نامہ (جلد اول صفحہ ۸۸) میں لکھا ہے کہ:

"امیر حسین اور حضرت صاحبقرانی نے پورے لشکر کو لے کر وہاں سے کوچ کیا اور خزار کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں خواجہ شمس الدین کے مزار متبرکہ کی زیارت کی اور دین کے اس بزرگ کی روح قدس سے ہمت میں مدد چاہی اور عہد و پیمان کا عقدہ محکم کیا۔"

اس دل سوز اور جانکاہ عمل سے سخت دکھ اور نفرت ہوئی ہوگی۔ مختصر یہ کہ بجائے اس کے کہ ایک طاقتور حکومت برسرکار آئے اور بے نوا اور فاقہ مست لوگوں کو مصیبتوں سے نجات دلائے ان کی بدبختی اور بے چارگی میں اضافہ ہی ہوا۔ یہ ایک زہریلی ہوا تھی جو خواجہ حافظ کی باغ و گلستان میں چلی۔ ایسے حالات میں انھوں نے "ترک سمرقندی" کے ساتھ خیالی عشق کو فوراً ترک کیا اور درج ذیل غزل ان بدلے ہوئے حالات میں شاعر کے عکس العمل کی نشاندہی کرتی ہے:

دو یار زیرک و از بادہ کہن دومنی فراغتی و کتابی و گوشۂ چمنی

الخ . . . .

شوشتر سے زین العابدین نے بغداد کا ارادہ کیا تھا لیکن جب اسے خبر ملی کہ تیمور واپس سمرقند چلا گیا ہے تو وہ بھی بغداد کے ارادے سے منحرف ہو کر شیراز کی طرف چل پڑا۔ لیکن شاہ منصور کی ایک چال کے نتیجہ میں وہ قید ہوا۔ شیرازیوں نے جب سنا کہ شاہ منصور شیراز کی طرف آ رہا ہے، وہ بہت خوش ہوئے اور گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا۔ ان کی گرمجوشی کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ شاہ یحییٰ کی بری خصلت سے تنگ آ چکے تھے۔ شاہ منصور دلیری اور جانبازی میں مشہور تھا۔ شیراز پہنچ کر وہ شاہ شجاع کے بنائے ہوئے ایوان میں اترا۔ ادھر شاہ یحییٰ شیراز چھوڑ کر یزد کی طرف جا نکلا۔

۶ - شاہ منصور

حافظ نے شاہ منصور کی مدح میں کئی اشعار کہے ہیں۔ غور سے مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس بادشاہ سے خلوص اور محبت رکھتے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ حافظ نے اپنے ہمعصر امراء یا سلاطین میں کسی کی اتنی پرزور تعریف نہیں کی ہے، جتنی شاہ منصور کی۔ ایسی غزلیں ان کی زندگی کے آخری دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ جب ان کی فکر نہایت پختہ ہو چکی تھی۔

کئی قلمی نسخوں میں واقعی طور پر اس کو قصیدوں میں شامل کیا گیا ہے، مطلع یہ ہے:

جوزا سحر نہاد حمایل برابرم
یعنی غلام شاہم و سوگند میخورم

درج ذیل تین غزلوں کا روئے سخن بلا شک و شبہ شاہ منصور ہی کی طرف ہے:-

۱- الا ای طوطی گویای اسرار — مبادا خالیت شکر ز منقار

۲- گرچہ ما بندگان پادشہیم — پادشاہان ملک صبح گہیم

۳- نکتۂ دلکش بگویم خال آن مہرو ببین — عقل و جان را بستۂ زنجیر آن گیسو ببین

حافظ سے منسوب ساقی نامہ میں بھی شاہ منصور کو یاد کیا گیا ہے۔

باقبال دارای دیہیم و تخت — بہین میوۂ خسروانی درخت
خدیو زمین پادشاہ زمان — مہ برج دولت شہ کامران
خدیو جہان شاہ منصور باد — غبار غم از خاطرش دور باد
بحمد اللہ ای خسرو جم نگین — شجاعی بمیدان دنیا و دین
بمنصوریت شد در آفاق نام — کہ منصور بودی بر اعدا دوام
.... الخ

درج ذیل قطعہ میں حافظ نے شاہ منصور کے حق میں دعا کی ہے:

روح القدس آن سروش فرخ — بر قبۂ طارم زبرجد
میگفت سحر گہی کہ یارب — در دولت و حشمت مخلد
بر مسند خسروی بماناد — منصور مظفر محمد

یہی مورّخ آگے چل کر صفحہ ۳۰۰ پر لکھتا ہے؛

"جب حضرت صاحبقران اندخود پہنچا تو صدق نیت و صفائے خاطر سے بابا سنگو کی زیارت کو گیا۔ وہ صاحب جذبہ بزرگ تھا۔ اس نے جنون وجذبہ کی حالت میں اپنے سینہ کو نوچ کر گوشت امیر تیمور کی طرف پھینکا۔ امیر نے اسے نیک شگون سمجھا اور کہا کہ خدا تعالیٰ نے خراسان کو جو روئے زمین کا سینہ ہے مجھے سونپ دیا ہے، اور ایسا ہی ہوا۔"

امیر تیمور اور مولانا زین الدین ابوبکر تایبادی کے درمیان ملاقات کا حال گزشتہ اوراق میں قلمبند ہو چکا۔ اس کی تکرار بے جا ہے۔ لیکن اس حکایت سے یہ بات ماننے میں مدد ملتی ہے کہ تیمور کس قدر صوفیہ و مشائخ سے عقیدت رکھتا تھا۔ ابن عرب شاہ نے اپنی کتاب "عجائب المقدور" میں امیر تیمور کے جو حالات درج کئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں کچھ لوگ اُس کو "دجال" کے لقب سے پکارتے تھے۔ چنانچہ امیر تیمور کی موت کے بعد پیر علی تاز نے پیر محمد کے خلاف عَلَم بغاوت بلند کیا اور اس ضمن میں عرب شاہ نے لکھا ہے:

"....وشرع یقول وھو یصول ویجول امور الدنیا و اضطرابت و اشراط الساعة اقتربت وھذہ دولة الدجالین وآدان تغلب الکذابین والمحتالین معنی تیمور و ھو الدجال الاعرج وھذا زمان الدجال الاقرع وسیاتی بعد ھذا الدجال الاعور" [۱]

دیوان حافظ میں پچیس اشعار کی ایک غزل ملتی ہے جس میں شاہ منصور کی مدح کی گئی ہے اکثر نسخوں میں اس منظومہ کو غزلیات میں شامل کیا گیا ہے۔ لیکن اشعار کی تعداد، اسلوب بیان اور ہیئت مضمون کی بنا پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ دراصل شاہ منصور کی مدح میں قصیدہ ہے۔

---

[۱] عجائب المقدور۔ چھاپ مصر۔ صفحہ ۱۹۵

قزوینی کے مطبوعہ دیوان حافظ میں ایک قطعہ موجود ہے جو حافظ نے کسی شخص (خواجہ) سے مخاطب ہو کر لکھا ہے۔ اس میں وظیفہ کی گزارش کی گئی ہے۔ یہ خواجہ کون تھا، معلوم نہ ہو سکا۔ قطعہ یوں ہے:

بہ سمع خواجہ رسان ای ندیم وقت شناس
بخلوتیکہ درو اجنبی صبا باشد

لطیفہ ای بمیان آر و خوش بخندانش
بہ نکتہ ای کہ دلش را بدان رضا باشد

پس آنگہش ز کرم این قدر بلطف بپرس
کہ گر وظیفہ تقاضا کنم روا باشد

کہا جاتا ہے کہ شاہ منصور نے اہل علم کا سابقہ وظیفہ برقرار رکھنے کا حکم دیا تو خواجہ حافظ نے اس کی مدح میں ایک قصیدہ کہا، اس ضمن میں مطلع السعدین کی متعلقہ عبارت کو یہاں نقل کیا جاتا ہے:

"... شاہ منصور تخت فارس را کہ مدتہا در آرزوی آن بود با آسان ترین وجہی مسخر ساخت و چون در آن ولا الوغ بلا کہ از شرح استغنا دارد بہ متوطنان فارس رسیدہ بود شاہ منصور ایشان را نوید عدل داد و الحق بجای آورد و یکی از وزراء میاومیات (یعنی وظیفہ) ارباب عمایم را مبلغ ہفتاد تومان بود خواست کہ بہ نصف آورد. شاہ غضب فرمود ما این مردم را وعدہ عدل دادہ ایم۔ ہیچگونہ میادمہ کہ آبا و اجداد ما دادہ باشند ناقص کنیم۔ فرمود کہ از آنقدر وجوہ ساختہ بسوثت قسمت کنند و فرمود کہ ما دو لشکر داریم۔ صوری شما یید و معنوی سادات و علماء و مشایخ و محتاجان۔ فی الجملہ اہل فارس بقدوم او استبشار نمودند و جراحات

یہاں تک جن تاریخی واقعات کا ذکر ہوا وہ ۷۸۹ ہجری تک ہی پھیلے ہوئے ہیں، حافظ کی وفات ۷۹۲ ہجری میں واقع ہوئی۔ اس لیے قبل ازیں کہ ہم تاریخ کے اس باب کو بند کریں مناسب ہوگا مظفری خاندان کے زوال کی دردناک کہانی بھی بیان کی جائے تاکہ ایک صدی تک برسر اقتدار رہنے کے بعد اس خاندان کا انجام بھی معلوم ہو جائے۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ حافظ نے عمر کے آخری ایام میں جب کہ وہ پیری اور ضعف سے دوچار ہو رہے تھے، اپنے معاصر بادشاہ منصور کی نسبت بڑی محبت کا اظہار کیا۔ ذیل میں ہم شاہ منصور کی مدح میں کہے گئے کچھ اشعار اور اُن کی شان نزول کے بارے میں اپنی معلومات کو قلمبند کریں گے۔

جب شاہ منصور نے شاہ یحییٰ کو شیراز سے بھگایا اور خود فارس کی حکومت پر قابض ہوا تو اہل قلم میں سے کسی نے اس کے تئیں اپنی وفاداری کا ثبوت دینے کی مکارانہ غرض سے اہلِ علم کے وظیفہ میں تخفیف کی۔ جن وظیفہ خواروں پر اس حکم کا اثر پڑا ان میں حافظ بھی شامل تھے جب اُن کی صدائے احتجاج شاہ منصور تک پہنچی تو اس نے اہل کاروں کو بلا کر بڑی ملامت کی اور کہا کہ میرے بزرگوں نے اہل علم کے لیے جو بھی وظیفہ مقرر کیا ہے وہ کسی تخفیف یا کسر کے بغیر انھیں باقاعدہ ملنا چاہیے۔ کہا جاتا ہے کہ متعلقہ اہلکار نے پچیس فیصد کا حکم جاری کیا تھا، یعنی یہ مقرر کیا تھا کہ بجائے دس کے ساڑھے سات ادا کیے جائیں۔ جب شاہ منصور نے ساڑھے سات (ہفت و نیم) کو پھر دس میں بدل دیا، یعنی تخفیف کو رد کیا تو حافظ نے یہ قطعہ لکھ کر خدمت میں پیش کیا۔

بادشاہا لشکر توفیق ہمراہ تو اند	خیز اگر بر عزم تسخیر جہان رہ میکنی
با چنین جاہ و جلال از پیش گاہ سلطنت	آگہی و خدمت دلہای آگہ میکنی
با فریب رنگ این نیلی خم زنگار فام	کار بر وفق مراد صبغۃ اللہ میکنی
آنکہ دہ با ہفت و نیم آورد بس سودی نکرد	فرصتت بادہ کہ ہفت و نیم با دہ میکنی

عماد الدین کا نام اوپر لیا گیا۔ اس سے منسوب ایک دلچسپ قصّہ کو یہاں درج کرنا چاہیے، جو حافظ کی ایک غزل سے متعلق ہے۔ دیوان حافظ میں اس مطلع کی مشہور غزل ہے:

ساقی حدیث سرو و گل و لالہ میرود

وین بحث با ثلاثہ غسالہ میرود

اس کا مقطع یوں ہے:

حافظ ز شوق مجلس سلطان غیاث الدین

غافل مشو کہ کار تو از نالہ میرود

شبلی نعمانی نے شعر العجم میں لکھا ہے کہ غیاث الدین بنگال کا سلطان تھا۔ اس نے حافظ کو ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی، لیکن حافظ نے معذرت چاہتے ہوئے یہ غزل شکرانہ کے طور پر بھیجی۔ شبلی نے اس حکایت کو کس تذکرہ سے نقل کیا ہے، ہمیں معلوم نہ ہو سکا۔ شبلی اور اکثر ہندوستانی تذکرہ نویسوں کے لیے اس حکایت پر یقین کرنے کے لیے غزل کا یہ شعر موثر رہا ہے

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند

زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ میرود

پروفیسر براؤن نے تو شبلی ہی سے نقل قول کیا ہے اور اس مقولہ کی صحت یا عدم صحت کی تمام تر ذمہ داری شبلی پر ہی ڈالی ہے۔ لیکن کچھ محققوں نے اس بات کو غلط اور بے بنیاد بتایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ سلطان غیاث الدین شاہ منصور کے چچا اور شاہ شجاع کے بھائی، عماد الدین (جس کا نام اوپر آیا ہے)، کا بیٹا تھا۔ آل مظفر سے متعلق تواریخ میں بارہا سلطان غیاث الدین کا ذکر آیا ہے۔ ان میں حافظ ابرو اور محمود گیتی، دونوں کی تاریخیں شامل ہیں، جو ہر لحاظ سے مستند ہیں۔

ڈاکٹر غنی کا یہ قول درست نظر آتا ہے کہ:

خدنگ حوادث بر جسم مرحمت او التیام یافت. مولانا حافظ شیراز کارنامہ
در آں ایام فرماید:

چو زاسحر نہاد حمایل برابرم
یعنی غلام شاہم و سوگند میخورم

شاہ منصور کی مدح میں حافظ کی ایک اور غزل ہے۔ اس میں کل تیرہ شعر ہیں۔
مطلع یوں ہے:

من نہ آں رندم کہ ترک ساغر و شاہد کنم
محتسب داند کہ من این کارہا کمتر کنم

اسی غزل میں شاہ منصور کی مدح میں ایک شعر ہے جو عام نسخوں میں نہیں ملتا صرف
ملا سودی کی شرح میں اسے دیکھا گیا اور مقطع سے دو بیت پہلے درج ہوا ہے شعر
یہ ہے:۔

من غلام شاہ منصورم نباشد دور اگر
از سر تمکین تفاخر بر شہ خاور کنم

۹۲ ہجری میں شاہ منصور نے اصفہان کو مسخر کرنے کی ٹھانی تاکہ سلطان زین
العابدین کی طرف سے لاحق ہونے والے کسی بھی خطرے کا سد باب کیا جا سکے۔ لیکن
اس کے ساتھ ہی سلطان زین العابدین نے سلطان احمد اور ابو اسحاق کو ساتھ ملا کر
شیراز پر لشکر کشی کی غرض سے حرکت کی۔ شاہ منصور کو مجبور ہو کر شیراز کی طرف کوچ کرنا پڑا۔
اور فا کے قریب دونوں فوجوں میں گھمسان کا رن پڑا جس میں شاہ منصور کامیاب ہوا۔
سلطان زین العابدین کی فوج کی ایک ٹکڑی کی کمان سلطان عماد الدین کر رہا تھا۔ وہ
شاہ منصور کا چچا اور شاہ شجاع کا بھائی تھا۔ اس فتح کے بعد شاہ منصور بڑی فراغت
سے شیراز اور اس کی نواحی، بلکہ تمام فارس کی حکمرانی کرتا رہا۔

"..... شاہ منصور نے شہر شیراز کی مدافعت کی جو اسکیم بنائی تھی کچھ حالات کی مجبوری کی بنا پر اس میں تبدیلی کرنی پڑی۔ اب فیصلہ یہ ہوا کہ تیمور کی یلغار کے سامنے، ہٹ جانا بہتر ہوگا۔ لیکن شہر کی کچھ بدبخت بوڑھی عورتوں نے شاہ منصور کی ملامت کرنا شروع کی کہ یہ "ترکش سجرام" ؟) ہمارے مال اور خون پر حکمران تھا لیکن وقت ضرورت ہمیں دشمن کے ہاتھوں میں دے رہا ہے۔ خدا سلحہ اس پر حرام کرے۔ اس ملامت سے اس کی حسِ غیرت جنبش میں آئی۔ اس کی عقل اندھی ہوگئی، اور حمیت جاہلیہ اس پر غالب آئی۔ یہ طے شدہ تدبیر سے منحرف ہوا، اور مصمم ارادہ کیا کہ وہاں ہی ڈٹ کر مقابلہ کرے۔ بدقسمتی سے اس کے ملازموں میں ایک غدّار نکلا جس کی راہ و رسم تیمور اور اس کے فوجیوں سے تھی ...... جنگ کی رات شاہ منصور نے ایک انتہائی سرکش گھوڑے کی دُم کے ساتھ کانسی کی بڑی دیگ مضبوطی سے باندھی اور اُسے دشمن کی صف میں لاکر چھوڑا۔ گھوڑا بے تحاشا بپھرا، سہما ہوا تیموری صفوں میں بے بندو بار دوڑتا بھاگتا رہا۔ اس قدر شور و غل بپا ہوا گویا شور محشر تھا۔ شاہ منصور ایک طرف کمین میں بیٹھا تھا۔ تیموری لشکر کی ٹکڑیاں اِدھر اُدھر تتر بتر ہوگئیں، اور صبح تک منصور کے سپاہیوں نے ان کی خاصی تعداد کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ دن چڑھتے شاہ منصور کے پاس صرف پانچ سو دلیر اور جانباز سپاہی ساتھ تھے۔ اس نے شیر نر کی طرح تیموری صفوں پر حملہ کیا، اور دائیں بائیں تار و مار کرتا رہا۔ محاربہ کے دوران زور سے للکارتا رہا "منم شاہ منصور" "منم شاہ منصور"۔ تیموری لشکر کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ اور شاہ منصور اس مقام پر تاخت کر سکا جہاں تیمور تھا۔ وہ بھاگا اور

"سلطان" مظفری خاندان کے بادشاہوں کے نام کا حصہ ہے
نہ صرف لقب۔ مثلاً سلطان اویس۔ سلطان احمد۔ سلطان مہدی
وغیرہ۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ شاہ شجاع کی بیٹی کا نام سلطان پادشاہ
تھا۔"

اس لیے شعر مذکور میں سلطان غیاث الدین کا نام ہے، نہ کہ صرف سلطان بنگال،
اس دلیل کے پیش نظر ممکن ہے کہ حافظ کے شعر کا اشارہ اسی سلطان غیاث الدین
بن عماد الدین کی طرف ہو، جو باقی بدبخت مظفری شاہزادوں کے ساتھ تیمور کے
ہاتھوں قتل ہوا

۷۹۲ ہجری میں شاہ منصور نے اصفہان پر چڑھائی کی اور سلطان زین العابدین
کو وہاں سے بھگا دیا۔ لیکن اب کی بار اس کا تعاقب کرتا رہا، اور ری یا تہران
کے قریب آ کے، پکڑ کر نابینا کروا دیا گیا۔ اگلے سال متواتر یہ خبر آتی رہی کہ
تیمور سمرقند سے نکل کر ایران کی طرف بڑھ رہا ہے۔ شمال خراسان۔ مازندران
اور سلطانیہ سے گزر کر سال ۷۹۵ ہجری میں وہ عراق و عجم کی طرف متوجہ ہوا۔ شوشتر اور
دزفول سے ہوتا ہوا فارس میں داخل ہوا۔ اس کی پیش قدمی کی خبر شاہ منصور کو برابر
ملتی رہی۔ پہلے تو فرار کا ارادہ کیا۔ لیکن بعد میں اس سے منصرف ہو کر مقاومت کو مناسب
سمجھا۔ شاہ منصور نے جس دلیری اور شجاعت سے اس عظیم خونخوار اور زبردست فاتح
کا ڈٹ کر مقابلہ کیا وہ تاریخ ایران، بلکہ تاریخ جہان میں شجاعت کی معدودے چند
مثالوں میں شامل ہے۔

مورخوں نے اس خونریز جنگ کی تفصیل وضاحت سے درج کی ہے۔ اس
بارے میں ہم ابن عرب شاہ کی تاریخ "عجائب المقدور" میں مندرج عبارت کو عیناً
لیکن مختصر طور یہاں نقل کریں گے:۔

اور اس کی شجاعت و دلیری کی بڑی تعریف کی ہے۔ شیراز میں داخل ہو کر تیمور نے شاہ منصور کے خزینہ، دفینہ اور دیگر ذخیروں پر قبضہ کیا اور لوگوں کا مال و جائیداد زبردستی چھین لیا۔"

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۴۶) کا اشارا اسی شاہ منصور کی طرف ہو۔ اگرچہ گزشتہ اوراق میں چند دلائل کی بنا پر ہم نے زین العابدین کو ہی قرین قیاس خیال کیا تھا۔

مرا نظام شامی نے لکھا ہے کہ اس دن شاہ منصور نے اپنی فوج کو بڑی ہمت اور حوصلہ دیا کہ اگر معرکہ میں مارے نہ جائیں، موت پھر بھی ہماری کمین میں ہے۔ چنانچہ بلند آواز میں بے باک ہو کر للکارتا رہا:

بر آنم کہ گردن فرازی کنم | بہ شمشیر با شیر بازی کنم
من امروز کاری کنم بیگمان | کہ بر ناورد مداران سرایہ جہان

جب وہ تیمور کی طرف لپکا، تیمور نے چاہا اس پر نیزہ مارے، لیکن نیزہ دار جنگ کے ہول سے بھاگ گیا تھا۔ شاہ منصور بجلی کی طرح کوندا اور دو بار تیمور پر شمشیر کے وار کئے۔ اگر عبدی اختاجی سپر کو بلند نہ کرتا تو اس دن تیمور، شاہ منصور کے ہاتھوں ہلاک ہوا چاہتا تھا

شیراز کے شمال میں "گور منصور" یا "تل منصور" نام کی ایک جگہ پر مقبرہ ہے جس کی ظاہری شکل و صورت ایران کے امام باڑوں کی سی ہے یعنی بقعہ، ضریح اور قندیل کے لحاظ سے یہ امام باڑہ لگتا ہے۔ ڈاکٹر غنی نے کئی بار اس جگہ کو غور سے دیکھا ہے لیکن قدیم تاریخ کا کوئی نشان وہاں نہیں ملتا۔ لوگ اس کو "مقبرہ شاہزادہ منصور" کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس جگہ زیارت نامہ کے عنوان سے چند تختیاں بھی ہیں۔ ایک پر یہ عبارت ہے:

"السلام علیک یا شاهزادہ منصور و رحمۃ اللہ و برکاتہ"

سر پر نقاب ڈال کر عورتوں میں روپوش ہوا۔ جب شاہ منصور وہاں پہنچا تو محلوں نے چیخ چیخ کر کہا ہم عورتیں ہیں اور تیمور جس کو تم ڈھونڈھ رہے ہو، میدان جنگ کے فلاں نقطہ میں ہے۔ منصور اس جگہ کی طرف جا نکلا جس طرف عورتوں نے اشارہ کیا تھا اور دائیں بائیں اس قدر شمشیر زنی کی کہ اس کے بازو تھک کر چور ہو گئے۔ اس کے ساتھیوں میں صرف دو شخص توکل اور مہتر فخر اس کے ساتھ رہ گئے۔ کئی کاری زخم کھا کر شاہ منصور نڈھال اور تشنگی سے جاں بلب ہوا لیکن پانی میسر نہ ہو سکا۔ اگر اسے پانی پینے کو ملتا تو کس کی مجال تھی کہ اس پر غالب آسکتا یا اس کا راستہ مسدود کرتا۔ پیاس کی شدت سے بے جان ہو کر وہ مقتولوں میں جا گرا۔ توکل بھی مارا گیا۔ لیکن مہتر فخر بچ نکلا۔ اس شخص کے جسم پر اگرچہ ستر زخم تھے، لیکن طویل عمر پا کر نوے سال کی عمر میں فوت ہوا۔ امیر تیمور نے شاہ منصور کو ڈھونڈنے اور اپنے سامنے لانے کا حکم دیا۔ رات ہو چکی تھی۔ ایک چغتائی سپاہی شاہ منصور کے قریب آیا۔ وہ مجروح اور نڈھال مقتولوں کے درمیان پڑا تھا۔ چغتائی سپاہی سے کہا کہ میرے پاس ایک قیمتی ہیرا ہے، اسے لو اور مجھے زندہ رہنے دو یا میرے لواحقین کے سپرد کر دو میں اس بھلائی کا نیک بدلہ تمہیں دوں گا۔ چغتائی سپاہی پر اس کی باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کا سر تن سے جدا کر کے تیمور کے سامنے پھینکا۔ تیمور کو شک ہوا شاید یہ منصور کا سر نہیں۔ لیکن ایک جماعت نے اس کے چہرہ پر سیاہ خال دیکھ کر تصدیق کی۔[1] امیر تیمور اس کی موت پر افسوس کرتا رہا۔

---

(۱) کوئی تعجب نہیں کہ حافظ کا مشہور شعر

اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل ما را
بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

ان کے بارے میں مشورہ کیا۔ سبھوں نے یہ رائے دی کہ مظفری شاہزادوں کا کرمان اور فارس میں بہت زیادہ اثر رسوخ ہے۔ اگر رہا کئے جائیں تو قلیل مدت میں اپنے ہاتھ پھر مضبوط کریں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ ان کا خاتمہ کیا جائے۔ تیمور کو یہ رائے موافق آئی۔ چوں کہ تیمور کی فوجیں اصفہان کی طرف کوچ کر رہی تھیں اس لیے یہ شاہزادے بھی قیدی بنا کر کڑی نگرانی کے تحت ساتھ لے جائے جا رہے تھے۔ اصفہان کے قریب ماہیار کے مقام پر ان سبھوں کو تیمور کے حکم سے موت کے گھاٹ اتارا گیا(۱)

اس زمانے کے کسی شاعر نے اس واقعہ سے متعلق یہ قطعہ کہا ہے ؎

بہ عبرت نگہ کن بہ آل مظفر	شہانی کہ گوی از سلاطین ربودند
کہ در ہفتصد و خمس و تسعین ز ہجرت	دہم شب ز ماہ رجب چون غنودند
چو خرمان نبان دہ رز مانی برستند	چو تیرہ بانگ زمانی درودند

مظفری خاندان میں سے صرف سلطان زین العابدین اور سلطان شبلی بچ گئے۔ لیکن وہ دونوں نابینا کر دئے گئے تھے۔ امیر تیمور نے ان دونوں کو سمرقند بھجوا دیا جہاں دونوں طبعی موت مرے۔ چناں چہ اس طرح حافظ کی وفات کے صرف تین سال بعد

(۱) ابن عربشاہ نے اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے۔ ملوک عراق و عجم کے اٹھارہ آدمی اس کے پاس جمع ہوگئے۔ یہ سب بادشاہ۔ شاہزادے اور بادشاہوں کے بھتیجے وغیرہ تھے۔ ان میں سے ہر ایک عراق، عجم کے کسی حصے پر تسلط رکھتا تھا۔ مثلاً سلطان احمد شاہ یحیٰی وغیرہ۔ ایک دن اتفاق سے یہ سب جماعت امیر تیمور کے خیمے میں اس کے سامنے اکٹھی ہوئی اور امیر تیمور ان کے درمیان اکیلا تھا۔ ان میں سے ایک نے شاہ یحیٰی کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ موقعہ کو غنیمت سمجھ کر اس پر حملہ کرے اور اسے قتل کرے تیمور اس کی نیت کو جان گیا۔
کچھ دن بعد تیمور جلسہ عام میں سرخ لباس پہن کر آیا اور ان اٹھارہ ملک زادوں کو بلوایا اور انھیں قتل کرنے کا حکم دیا۔ فی الفور سبوں کو نابود کر دیا گیا۔ (عجائب المقدور صفحہ ۳۶)

اس واقعہ کے ساتھ مظفری خاندان کا چراغ گل ہونے لگا، اور ان کا حتمی خاتمہ ایک دلدوز اور عبرت ناک واقعہ کے ساتھ ہوا۔

امیر تیمور نے حکم دیا کہ اس خاندان کے تمام شہزادے اس کے سامنے لائے جائیں۔ چنانچہ یک بہ یک سبھوں کو حاضر کیا گیا۔ ان میں یہ لوگ شامل تھے۔

(۱) سلطان عماد الدین (مبارز الدین کا بیٹا اور شاہ شجاع کا بھائی)۔

(۲) سلطان مہدی (شاہ شجاع کا بیٹا اور سلطان احمد کا داماد)۔

(۳) شاہ یحییٰ، اور اس کے فرزند سلطان محمد اور معز الدین جہانگیر، حکمران یزد۔

(۴) سلطان ابو اسحاق (شاہ شجاع کا پوتا، اور سلطان اویس کا بیٹا)۔ حکمران سیرجان۔

(۵) سلطان غضنفر (شاہ منصور کا بیٹا)۔ شیراز۔

(۶) سلطان غیاث الدین (سلطان عماد الدین کا بیٹا)، کرمان۔

دربار میں حاضر ہونے کے بعد تیمور نے ان سے کہا کہ اگر تم میرے ساتھ موافقت کرتے تو اسی وقت میرے لشکر کے ساتھ مل جاتے جس وقت میں نے اور سادہ میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔

تم اس انتظار میں تھے کہ میرے اور شاہ منصور کے درمیان کس کا پلہ بھاری ہو جائے، تاکہ اسی کے ساتھ ملحق ہو جاؤ۔

بہرحال ان سب شاہزادوں کو قید کیا گیا۔ امیر تیمور نے امراء کے ساتھ

باقی حاشیہ صفحہ ۲۴۷:۔ کریم خان زند کے منشی میرزا محمد کرمانی نے خلاصۃ العلوم کے منتخب "لب خلاصۃ العلوم کی ساتویں اور آخری جلد میں ایک جگہ لکھا ہے:

"قبر شاہ منصور در یک فرسخی شیراز است"

غلط نامہ

مظفری خاندان کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا اور حافظ کی پیشین گوئی گویا درست ثابت ہوئی جو امیر مبارز الدین کے ذریعے شاہ شیخ ابو اسحاق پر کیے گئے ظلم اور ستم کے بارے میں کی گئی تھی۔

اگر چہ خصم تو گستاخ میرود حالی
تو شاد باش کہ گستاخیش چنان گیرد
کہ ہر چہ در حق این خاندان دولت کرد
بجزائش در زن و فرزند خان و مان گیرد

▲

غلط نامہ

صفحہ	سطر	غلط	درست
۱۳	۴	دانست ور	دانست اور
۱۵	۱۵	....برقی از	تاجہای برخی از
"	۱۶	شہرزاد	شیراز
۱۶	۱۸	کلوبیٹر کی بلندی	ملیٹر کی بلندی
۱۹	۶	بزرگ است	بزرگ است از
۲۳	۱۸	اہمیت کے حایل	اہمیت کے حامل
"	حاشیہ	مسعودی	سودی
۲۴	۶	لعث	لیث
۲۶	۲	ناآب	تاآب
۲۷	۸	فجابرہ	مخابرہ
۲۸	۹	مکتوف	مکشوف
۲۹	۱۸	قرار دویکی	قراردارد ویکی
۳۷	۱۶	ضرورت تھی حقیقت	ضرورت تھی جو حقیقت
۴۰	۲	گداد	گڈارڈ
۴۱	۳	پہلا قدم	پہلا مقام
"	۱۰	بد لند	بہ لند

صفحہ	سطر	غلط	درست
۷۰	۳	بیش خدمتیوں	پیش خدمتوں
"	۲۰	کرتے ہے ہیں	کرتے رہے ہیں
۷۱	۱	حجازی	مجازی
"	۳	دیون	دیوان
"	۵	رسالہ سنہ ۱۳۰۴ھ	رسالہ تہران میں
"	"	دوسری بار	دوسری بار شیراز میں چھپا
"	۱۴	لطیفۂ غیبیہ	لطیفہ غیبیہ میں
۷۲	۶	علمای	علمای
"	۱۵	زسعدی تاحاجی	از سعدی تاجامی
۷۳	۱		احوال و آثار حافظ
"	۴	وقتاً	وقتاً فوقتاً
"	۱۰	حافظ سناس	حافظ شناس
۷۶	۱۸	ہجری میں	ہجری میں شیراز
۸۱	۶	آدھی رات	یہ کام آدھی رات
۸۲	۱۲	اقا بواسطہ	آقا بواسطہ
۸۲	۱۳	استفقات	اشتقات
"	۱۶	مطا	مطالعہ
۸۴	۱۲	مطالع ہے	مطالع سے
۸۶	۱۵	مسودین	مسود این
۸۸	۶	کیا چکا ہے	ہو چکا ہے

صفحہ	سطر	غلط	درست
۴۴	۱	پاپئی	پاپینی
۴۷	۴	خواجہ وسان	خواجہ رسان
۴۸	۸	ان میں فان	اُن میں عرفان
۴۸	۱۷	واہلِ طبع	زاہلِ طبع
″	″	تراجع	تراجح
″	۱۸	میکند	میکنند
۴۹	۲	برس	پُرس
″	۱۹	شبی گہ دری	شبی کہ روی
۵۰	۱۸	خوش آسای زمانی	خوش برآسای زمانی
۵۱	۳	باب میں	باب میں ہم
۵۲	۵	.... وکنند	وکنند
″	۲۰	دیوان السد	دیوان البسہ
۵۶	۱۸	آنا فا	آناً فاناً
۵۷	۱۲	حملہ آور	حملہ آور ہوا
۵۷	۱۸	۱۹۳۶ء	۱۹۳۶ء میں یہ
۵۸	۴	بالقرا	بایقرا
″	۱۳	الدرائیُ	الدارائیُ
۵۹	۸	مغائرت	مغایرت
۶۲	۱۲	نقشی حافظ	نقشی از حافظ
″	۱۵	شبلی نعمانی	شبلی نعمانی نے

صفحہ	سطر	غلط	درست
۱۳۶	۶	کہ با جانان در	کہ تا جان در
۱۵۱	۲۰	ان کے نیر	ان کے یزد
۱۵۵	۲	امیر کخسرو	امیر کیخسرو
۱۵۷	۲۱	کہ قاقیبی	کہ قاضیبی بہ
۱۶۰	۱۴	افریدون حشم	افریدون حشر
"	۱۸	جومانی	جبہ مائی
۱۷۷	۱۸	ازآن واہگہ تطاول	ازان جور تطاول
۱۸۵	۵	قرہ العین	قرۃ العین
۱۹۳	۲۰	سبز جنگ	سبز جنگ
۲۰۴	۲	مسند قضا کرتا	مسند قضا
"	۵	اس کے مرقد	اس کی مرقد
۲۱۱	۲۱	دانہ خیرت	دانۂ خیرات
۲۱۵	۱۰	آہستہ او	آہستہ رو
۲۱۷	۱۹	کہ سلامت باد	کہ سلامت بادش
۲۱۸	۱	در ... کند	درد داد کند
"	۵	سہم آن روز	خرسم آن روز
۲۲۴	۲	جن ... گئی	جن میں گئی
"	۳	شاہ شجاہ	شاہ شجاع
۲۲۶	۴	مبارزالدین کی ... ہوگئی	مبارزالدین کی تمام بری خصلتیں یکجا
۲۲۷	۱۲	باخوازمیان	باخوارزمیان

صفحہ	سطر	غلط	درست
۸۸	۶	علاوہ بھی چلتا	علاوہ بھی پتہ
۱۳۰	۳	کتاب	کتاب سے
۱۳۱	۶	کتاکی	کتاب کی
۱۳۲	۳	نسخہ	نسخوں
"	۴	بے اس	بے اساس
۱۳۳	۳	کیاجاتا	کیاجاتا ہے
"	۱۲	فوفوناک	مدفوناً بہ کت
"	۱۵	حصر	عصر
۱۳۴	۱۵	از.. تنگ	از وہلیز تنگ
۱۳۵	۱۵	گیارقلمی	گیارہ قلمی نسخوں
۱۳۶		یہ پورا صفحہ غلطیوں سے پُر ہے	
۱۳۷	۷	بشتند	بشستند
۱۳۸	۱۷	للطیفہ	لطیفہ
۱۳۵	۹	شواہ	مشواہ
۱۴۰	۱۶	کعب	مکعب
۱۴۵	۱۰	خرقۂ جائی	خرقۂ جائی گرد بادہ و دفتر جائی
۱۴۵	۱۳	نرگس ازلاف	نرگس ارلاف
۱۴۶	۲	حسین پژوان	حسین پژمان

کتب حوالجات

حوالہ جات

۲۳۳	حاشیہ۴	کدتزاہیر	کدنزدِ امیر
"	" ۵	وزیہ کانا	وزیر کا نام

▲

فہرست حوالہ جات

۱۔ از سعدی تا جامی۔ — علی اصغر حکمت۔ تہران

۲۔ المعجم فی معاییر اشعار العجم — محمد بن قیس رازی۔ تہران

۳۔ اشعار و احوال حافظ — سعید نفیسی۔ تہران

۴۔ الہامات خواجہ یا حافظ شناسی — محمد علی بامداد تہران

۵ الجماہر فی معرفت الجواہر — البیرونی۔ حیدرآباد۔ دکن

۶۔ آتش کدہ آذر — آذر بیگدلی۔ تہران

۷۔ بہارستان — عبدالرحمٰن جامی۔ تہران

۸۔ تاریخ جدید یزد — احمد بن حسین بن علی الکاتب۔ تہرن

۹۔ تاریخ جہانگشای — عطا ملک جوینی۔ تہران

۱۰۔ تاریخ عصر حافظ (۲) جلد — دکتر قاسم غنی تہران

۱۱۔ تاریخ جغرافیائی — حافظ ابرو۔ تہران

۱۲۔ تاریخ فرشتہ

۱۳- تاریخ آل مظفر

۱۴- تاریخ وصاف — وصاف الحضرت - تهران

۱۵- تذکرہ میخانہ — فخر النبی - تهران

۱۶- تذکرة الشعراء

۱۷- جامع التواریخ حسینی — حسن بن شهاب الدین یزدی - تهران

۱۸- حبیب السیر

۱۹- حافظ نامہ — عبدالرحیم خلخالی - تهران

۲۰- حافظ شیرین سخن — محمد معین - تهران

۲۱- حافظ تشریح — عبدالحسین هژیر - تهران

۲۲- خلاصۃ الافکار

۲۳- خلاصۃ الاشعار

۲۴- خزانہ عامرہ — آزاد بلگرامی - تهران

۲۵- دیوان سعدی شیرازی — تهران ایڈیشن

۲۶- دیوانِ حافظ — مرتبہ: حسین پژمان - تهران

۲۷- دیوان حافظ — مرتبہ: هاشم رضی - تهران

۲۸- دیوان روح عطار — تهران

۲۹- دیوان کمال خجندی — تهران

۳۰- دیوان حافظ — مرتبہ: مجید یکتائی - تهران

۳۱- دیوان حافظ — مرتبہ قزوینی و قاسم غنی - تهران

۳۲- در مکتب استاد — سعید نفیسی - تهران

۳۳ درسی از دیوان حافظ — سعید نفیسی - تهران

ریاض الشعرا — واللہ داغستانی تهران

۳۴۔ سخنی چند در باب احوال و اشعار حافظ	مجدزادہ صہبا۔ اصفہان ۱۳۲۱
مسند الابرار	فرحت اللہ شیرازی
۳۵۔ شرح سودی بر حافظ	عصمت ستارزادہ۔ تہران ۱۳۶۱؛
۳۶۔ شیراز۔	حسن امداد ۔ تہران
۳۷۔ شرح حال لسان الغیب	سیف پور فاطمی۔ تہران
۳۸۔ ظفرنامہ	نظامی شامی ۔ بیروت
۳۹۔ ظفرنامہ تیموری	شرف الدین علی یزدی
۴۰۔ فارس نامہ	ابن بلخی ۔ تہران
۴۱۔ عرفات العاشقین	
۴۲۔ فارس نامہ	ابوالعباس زرکوب۔ تہران ۱۳۱۰ھ
۴۳۔ قصاید	ملک الشعرا بہار
۴۴۔ کشف الاسرار	محمد افضل الہ آبادی۔ ہند
۴۵۔ کشف الظنون	حاجی خلیفہ ۔ مصر
۴۶۔ کلیات عبید زاکانی	مرتبہ: عباس اقبال ۔ تہران
۴۷۔ مجلہ یغما شمارہ ۳	خرداد۔ ۱۳۳۸۔ تہران
۴۸۔ مجالس النفایس	میر علیشیر نوائی۔ تہران
۴۹۔ مطلع السعدین	عبدالرزاق سمرقندی۔ ہند
۵۰۔ مجمع الفصحا	رضا قلی خان ہدایت۔ تہران
۵۱۔ مجالس العشاق۔	

۵۲۔ مجموعہ تاج الدین وزیر — (قلمی نسخہ، کتابخانۂ مجلس شورا ملی۔ تہران

۵۳۔ نزہت القلوب — حمد اللہ مستوفی۔ تہران

۵۴۔ نقشی از حافظ — علی دشتی۔ تہران

۵۵۔ نفحات الانس — جامی۔ تہران

۵۶۔ ہفت اقلیم — امین الدین رازی

9469717389
Riyaz

چراغ اس سے بھی جلے گا حافظ
کہ شعلہ از نور بیا